پبلک لائبریری

اس نام سے ہم نے ایک دارالاشاعت قائم کیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ ایسی کتابیں شائع کی جائیں جو عام پبلک کے لئے مفید ہوں۔ سردست ہمارے ہاں سے حسب ذیل کتابیں مل سکتی ہیں۔ محصول ڈاک خریدار کے ذمہ ہوگا:

اسوۂ حسنہ امام ابن قیم کی فن سیرت پر بہترین اور مستند کتاب "زاد المعاد" کا خلاصہ ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قابل دید کتاب ہے ۱۲

اصحاب صفہ امام ابن تیمیہ کی تصنیف از مولانا عبدالرزاق کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۱۰

ٹرکی اور یورپ یورپ نے ٹرکی اور اسلام پر کیا کیا ظلم کئے اس کی پوری داستان اس کتاب میں موجود ہے۔ از مولانا عبدالرزاق۔ قیمت ۶

جہنم کی آبادی از کونٹ ٹالسٹائی۔ مترجمہ مولانا عبدالرزاق۔ قیمت ۸

مصطفےٰ کمال پاشا غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے خود اپنی زبان سے اپنی پوری سوانح عمری لکھائی ہے۔ مترجمہ مولوی بدرالدین احمد منیجر "البلاغ" (کلکتہ) قیمت ۶

منیجر پبلک لائبریری نمبر ۱۱۔ بالی گنج سرکلر روڈ کلکتہ

اشرفیوں اور ہیروں کی قیمت مل رہی ہے۔ کیونکہ کام کرنے والے جتنے کم ہونگے، اتنی ہی کام کی مزدوری بھی بڑھ جائے گی۔ خزانۂ سعادت لٹنے کے لئے کھل چکا اور شرف و مراتب کا دروازہ ہر رہرو کے لئے باز ہے۔ کون ہے جو اُس کے خزانے لوٹتا اور راس دولت و کامرانی سے مالامال ہوتا ہے جس کے لئے نہ معلوم اچھے وقتوں میں کیسے کیسے ارباب طلب بیقراریوں کے آنسو بہا چکے ہیں اور آرزوؤں سے بھری ہوئی دعائیں مانگ چکے ہیں؟

فما لک و الترددحول نجد

وقد غصت تھامۃ بالرجال!
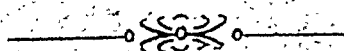
یقولون خبرنا فانت امینهم　　　وما انا ان خبرتهم بامین ؛

فصل

مقام "عزیمت دعوت" اور "احیاء و تجدید امت" کی نسبت یہ افکار پریشان بلاقصد زبان قلم پر آگئے، تو اگرچہ اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہ تھا، لیکن زیادہ تر یہ خیال باعث ہوا کہ شاید ان حالات و وقائع کا مطالعہ اصحاب صلاح و استعداد کے لئے کچھ سودمند علم و عمل ہو، اور بحکم "ان لم تبکوا فتباکوا" اور

فتشبهوا ان لم تکونوا مثلهم　　　ان التشبه بالکرام فلاح[1]

کسی کے قلب بصیرت و دیدۂ اعتبار کو ان مجددین ملت اور مصلحین حق کے اتباع و تشبہ کی توفیق ملے۔ شاید کوئی مزدکار اور صاحب عزم وقت کی پکار پر لبیک اور زمانہ کی طلب و جستجو کا سراغ بنے۔ آج اگر کام ہے تو بس یہی کام ہے اور ڈھونڈھنے تو صرف اسی کی۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز:

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں　　　گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

یہ حکایتیں اُن عہدوں کی تھیں جو موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں گویا عہد اقبال تھا۔ موجودہ وقت اور اُس کی تاریکیاں دیکھو، اور پھر ہر طرف روشنی اور روشنی دکھلانے والوں کی نایابی پر ماتم کرو۔ خدمت گذاروں کی پکار اور ہر طرف مزدوروں کی ڈھونڈھ ہے مگر مزدور کہیں نہیں ملتا [illegible] گری ہوئی دیوار پر ایک اینٹ رکھدینے کے ڈھادینے میں

سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اُس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدواروں پر امیدواریکے بعد دیگرے گذرتے رہے مگر اُس کا مستحق کوئی نہ نکلا:

بارِ غم او عرض بہر کس کہ نمودم
عاجز شد و ایں قرعہ بنامم زسرافتاد!

تو یہ وہی حقیقت ہے جو کتنی دیر سے تمہارے ذہن نشین کر رہا ہوں۔ یعنی اس وادی کا مردِ کار رہبر صاحب علم و عمل نہیں ہو سکتا:

مرد ایں رہ را نشانے دیگرست!

اُستادی و شاگردی، نو عمری و کہولت، خانقاہوں کی دھوم دھام، اور مدرسوں کا ہنگامہ، یہ ساری باتیں یہاں کے لئے بیکار رہیں۔ ان سارے عہدوں میں دیکھو۔ باعتبار علم و عمل ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود تھا، اور لقدرِ طاقت دعوت و تذکیر میں ساعی بھی تھا۔ تاہم دعوت دوسری چیز ہے اور عزیمت دعوت کا مقام دوسرا ہے۔ اس کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ گڑھیوں کا محاصرہ کر لینا آسان ہے مگر قلعوں اور ملکوں کی تسخیر کی دھن دوسری ہوتی ہے۔ ایک شخص کتنا ہی امیر الامرا ہو، لیکن پھر امیر ہے۔ بادشاہوں کا عزم اور محل شاہی میں پلے ہوؤں کا دماغ کہاں سے لا سکتا ہے؟

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئین سروری داند

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان و اسباب فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے۔ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اُسے ساتھ لے لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق

بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں سر سبو بکشادند و در فرو بستند!

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے تھے، اب اس سلطان وقت و اسکندر عزم کی بدولت شاہجہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اُن کا ہنگامہ مچ گیا۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو حجروں کے [illegible] بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسر بازار کہی جا رہی تھیں، اور خون شہادت کے چھینٹے حرف و حکایات کے نقوش و سواد بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے:

آخر تو لائیں [illegible] آفت فغاں سے ہم حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت [illegible] علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا [illegible] رکھنے والے معدوم [illegible] جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود اسی خاندان عالی میں اساتذۂ [illegible] درس و تدریس کی پادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر [illegible] اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ [illegible] دیکھا جائے تو کوئی گوشہ نہ تھا جہاں اُن کا [illegible] کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا [illegible] دوسرے کاموں میں رہ گئی۔ [illegible] کسی سے بھی بن نہ آیا؟ وہ گویا ایک [illegible] آیا۔ دنیا [illegible] منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے

ایک اور موقعہ پر کہتے ہیں " لما تمت بی دورۃ الحکمۃ" البسنی اللہ تعالیٰ خلعۃ المجددیۃ، فعلمت علم الجمع بین المختلفات۔ الخ[1]" اس باب میں ان کے اشارات بے شمار ہیں۔ علی الخصوص تفہیمات میں کہ متعدد رسائل ومقالات اسی مقام کی شرح وتحقیق میں لکھے ہیں، اور ان سب کے آخر میں ذوق باطن کے التہاب سے بیخود ہو کر اپنے معاملات کیطرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں۔ گویا ابو العلاء معری کا یہ شعر جا بجا نئے نئے پیرایوں میں ان کی زبان قلم اور کلک تحدیث تک آ آ کر رہ جاتا ہے:

وانی، وان کنت الاخیر زمانہ لآت بما لم تستطعہ الاوائل!

اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو۔ مقام عزیمت ودعوت کی کیسی آشکار امثال سامنے آتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع ہے؟ با ایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید وتدوین علوم ومعارف تک محدود رہا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل ونفاذ اور ظہور وشیوع کا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف علامۂ شہید کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ خود شاہ صاحب کا بھی اسمیں حصہ نہ تھا:

ہیچ خواست رستخیز زعالم بر آورد ان باغباں کہ تربیت ایں نہال کرد!

اگر خود شاہ صاحب بھی اُس وقت ہوتے تو اُنہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت ...ماری کا قول یاد رہے " من مرید خرقانی ام لیکن اگر خرقانی دریں وقت می بود، با وجود ...ن مریدی می کردم" شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عدم تحمل واستعداد سے مجبور ہو کر بحکم:

---

[1] ...للہ تعالیٰ نے مجھے مجددیت کی خلعت پہنادی ہے چنانچہ مجھے جمع بین المختلفات کا علم حاصل ہو گیا ہے الخ

بسماء۔ ولیست الارض علیہ بارض۔ فاھل الشرق و الغرب کلھم رعیتك وانت سلطانھم۔ علموا اولم یعلموا۔ فان علموا، فازوا، وان جھلوا، خابوا"[1]

ایک اور تفہیم میں لکھتے ہیں "ومن نعم اللہ علی ولا فخر، ان جعلنی ناطق ھذہ الدورۃ وحکیمھا، وقائد ھذہ الطبقۃ و زعیمھا، فنطق علی لسانی، ونفث فی نفسی۔ فان نطقت باذکار القوم واشغالھم، نطقت بجوامعھا۔ وان تکلمت علی نسب القوم فیما بینھم و بین ربھم، رویت لی منابتھا وقبضت علی جوامع خطامھا۔ وان خطبت باسرار اللطائف وغوامض الحقائق، تغوصت قاموسھا وتلمست ناعوسھا، وقبضت علی جلابیبھا واخذت بتلابیبھا۔ وان بحثت عن علم الشرائع والنبوات، فانا لیث عرینھا، وحافظ جرینھا، ووارث خزائنھا، وباحث مغابنھا، اتیتھم بعجائب لا تحصیٰ وغرائب لا تکاد تنسیٰ یدجی۔ شعر: وکم للہ من لطف خفی ٭ یدق خفاہ عن فھم الذکی"[2]

---

(۱) میرے رب نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ "ہم نے تجھے اس طریقہ کا امام بنایا ہے اور اب تحقیق قرب تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر کے صرف ایک راستہ کھلا رکھا ہے اور وہ تیری محبت اور پیروی کا راستہ ہے جو تیرا انتخاب ہے اس پر آسمان تنا ہے اور نہ زمین زمین۔ مشرق اور مغرب کے سب لوگ تیری رعیت ہیں اور تو ان کا سلطان ہے چاہے جانیں یا نہ جانیں اگر وہ یہ بات جان لیں تو ان کے لئے کامیابی ہے ورنہ خیبت و خسران۔

(۲) اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت بغیر کسی فخر کے یہ ہے کہ اس نے مجھے اس دور کا ناطق و حکیم اور اس طبقہ کا قائد و زعیم بنا دیا ہے جو میری زبان کے ذریعہ بولتا اور میرے قلب میں القا کرتا ہے۔ چنانچہ جب میں بولتا ہوں تو جوامع الکلم دیتا ہوں اسرار و حقائق، شریعت و نبوت کے متعلق تقریر کرتا ہوں میں بے شمار عجائب و غرائب پیش کر چکا ہوں ۔۔۔"

علم وطریقت کے اکابر واساتذہ اسی صدی میں سربرآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسل
درس وتدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں۔ ہندوستان سے باہر بلادِ عربیہ وعثمانیہ میں
اکثر مشاہیر علم وارشاد کا ظہور ہوا، جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی النجدی،
سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسماعیل یمانی،
شیخ عبدالخالق زبیدی، علامہ فلانی صاحب ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم
کہ شاہراہ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے ناآشنا نہ تھے۔ بایں ہمہ
معلوم ہے کہ وہ جو امام وقت کا مقام ہے وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی کے لئے تھا۔
اور لوگ بھی بیکار نہ رہے۔ کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لئے تھا:

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را

تفہیمات میں اس معاملہ کے معارف لکھتے ہوئے کہیں تو اپنی طرف بیگانہ وار اشارہ
کرجاتے ہیں۔ کہیں کہیں جوشِ قلبی کی بے اختیاریوں میں صاف صاف بھی لکھ گئے ہیں۔
اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں "نعمت عظمیٰ بریں ضعیف آنست کہ او را خلعت فاتحیت دادند،
وفتح دورۂ بازپسیں بر دست وے کردند"، تفہیمات میں لکھتے ہیں "بہ سرم درداد ند کہ ایں
حقیقت بردم برساں۔ امروز وقت وقت تست، وزمان زمان تو۔ وائے بر کسے کہ زیر لوائے تو
نباشد" ایک اور تفہیم میں یہ کیفیت زیادہ سرمستی کے ساتھ کھلی ہے "فہمنی ربی انا جعلناک
امام ھذہ الطریقۃ، وسددنا طرق الوصول الی حقیقۃ القرب کلھا الیوم
غیر طریقۃ واحدۃ، وھو محبتک والانقیاد لک، فالسماء لیس علی من عاداک

کہ قائم مقام انبیاء اولوالعزم باشد:

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　　دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

کچھ شک نہیں کہ توفیق الٰہی نے حضرت ممدوح کے وجود گرامی ہی کے لئے یہ مرتبۂ خاص کر دیا تھا۔ باقی جس قدر تھے، یا تو مدرسوں میں پڑھاتے رہے، یا موٹی موٹی کتابیں اور نئی نئی شرحیں اور حاشیے لکھتے رہے۔ یا پھر ان کی تضلیل و تکفیر کے فتووں پر دستخط کرتے رہے۔ دوسری جلد کے چوتھے مکتوب میں لکھتے ہیں "از حق الیقین و عین الیقین چہ گوید؟ و اگر گوید کہ فہم کند؟ ایں معاملات از حیطۂ ولایت بیست۔ ارباب ولایت بہ رنگ علماء ظواہر در ادراک آں عاجز اند۔ ایں کار مقتبس از مشکوٰۃ نبوت است کہ بعد از تجدید الف ثانی بہ تبعیت و وراثت تازہ گشتہ۔ صاحب ایں علوم و معارف مجدد ست" الخ

یہ جو بار بار کہہ رہا ہوں کہ وقت کا سلطان اور خزینہ دار ایک ہی ہوتا ہے۔ خواہ کوئی ہو اور کیسا ہی ہو مگر اُس سے الگ رہکر کچھ نہیں پا سکتا۔ تو یہ وہی حقیقت ہے جس کو بار بار حضرت ممدوح فرماتے رہے اور ان سے پہلے بھی تمام محرمان راہ نے اشارات کئے "مجدد آنست کہ ہر چہ دراں مدت از فیوض بہ امت رسد، بہ توسط او رسد۔ اگر چہ اقطاب و اوتاد آں وقت باشند"

خاص کند بندہ مصلحت عام را

پھر بارہویں صدی کا ایک عظیم ظہور علوم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چلی تھی، پھر بھی کھیتیوں کی سبزی اور چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ خالی نہ تھا۔ تیرہویں صدی کے تمام کاروبار

کے بارے میں سخت لغزش بھی ہوگئی۔ اصحاب طریقت میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارف کامل خود دہلی میں بعہد اکبری مقیم رہے۔ لیکن وہ خود کہتے تھے۔ میں چراغ نہیں ہوں۔ چقماق ہوں۔ آگ نکال دوں گا۔ چراغ احمد سرہندی ہے۔ جو حالت اُس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ترکستان و خراسان کی ہورہی تھی، ان سب کے سامنے تھی۔ بہت سے اس پر آہ و فغاں کرتے تھے۔ مگر اس سے معاملہ آگے نہیں بڑھتا تھا۔ ہندوستان میں سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ تمام عوام و خواص پر تصوف کا رنگ غالب تھا بحدیکہ اس کے سوا علماً و عملاً کوئی بات مقبول نہ تھی۔ لیکن تصوف صالح کا جوہر پاک جہل و بدعت کی آمیزش سے یکسر مکدر ہو چکا تھا۔ ایک طرح کی اباحت و مطلق العنانی تھی جس کو طریق باطن و اسرار سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ خانقاہوں اور سجادہ نشینی کے سلسلوں کے جال میں پوری اقلیم جکڑ بند تھی۔ دوسری طرف عہد اکبری کی بدعتیں تخت و تاج حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھیں، اور علماء سوء و مشائخ دنیا خود اُن کے احداث کے باعث ہوئے تھے۔ کون تھا کہ اُس وقت امن و عافیت کے مدرسوں اور سلطانی و فرمانروائی کی خانقاہوں سے نکلتا اور دعوت و اصلاح کی امتحان گاہ میں قدم رکھتا؟ خود حضرت موصوف ایک مکتوب میں اپنے فرزند کو لکھتے ہیں "اے فرزند! ایں وقت آنست کہ در امم سابقہ دریں طور وقتی کہ پر از ظلمت ست، پیغمبر اولوالعزم مبعوث می گشت، و بنائے شریعت جدیدہ می کرد۔ دریں امت کہ خیر الامم ست و پیغمبر ایشاں خاتم الرسل، علماء را مرتبۂ انبیاء دادہ اند، و از وجود علماء بوجود انبیاء کفایت فرمودہ اند۔ دریں وقت عالمے عارفے تام المعرفت ازیں امت در کار ست

فصل

مقصود اصلی اس تذکرہ سے یہ تھا کہ "دعوت" کا مقام دوسرا ہے اور "عزیمت دعوت" کا دوسرا۔ ضرور نہیں کہ ہر رہرو کی یہاں تک رسائی ہو۔ عہد ظہور دعوت میں ہزاروں اصحاب علم و کمال موجود ہوتے ہیں مگر دروازہ کا کھولنے والا صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ چند متفرق مثالیں تو دور کی تھیں۔ خود ہندوستان ہی کی تاریخ دیکھ لو۔ ہمیشہ ایسا ہی معاملہ نظر آئے گا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ لیکن مفاسد وقت کی اصلاح کا معاملہ کسی پر بھی بن نہ آیا۔ صرف شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔ معلوم ہے کہ اس عہد میں بڑے بڑے علماء و اصحاب خانقاہ موجود تھے۔ بدایونی طبقات اور روضۃ العلماء، اخبار الاخیار وغیرہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں عالموں اور پیروں کے سوا اور کوئی بستا ہی نہیں۔ علماء میں شیخ وجیہہ گجراتی، شیخ علی متقی، شیخ [illegible] تھانیسری، ملا محمود جونپوری، مولانا یعقوب کشمیری، ملا قطب الدین سہالوی، شیخ عبدالحق محدث، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا الہداد جونپوری وغیرہم اپنے وقتوں کے [illegible] علم کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے۔ بایں ہمہ دوسرے دوسرے گوشوں اور [illegible] [illegible] [illegible] شیخ عبدالحق کو تو حضرت مجدد

نہیں، وہ جیل خانے کے اندر ہر طرف نظر آنے لگیں۔ صاحب کواکب لکھتے ہیں" حتی صار المحبس بالاشتغال بالعلم والدین خیرًا من کثیر من الزوایا والربط والخوانق والمدارس" یہ معنی ہیں ایمان کامل اور مقام عزیمت علم و عمل کے۔ چراغ جہاں کہیں رکھا جائے گا، اُجالا ہو جائے گا، پھولوں کا گلدستہ طاق سے اُتار کر کوڑے کرکٹ کی ٹوکری میں ڈال دو لیکن اُس کی خوشبو ضرور پھیلے گی۔ مور نے کہا۔ میرا چمن میرے ساتھ ہے۔ باغ و بہار کا محتاج نہیں۔ جہاں کہیں اپنے ہزار رنگ پر کھول دوںگا ایک تختۂ چمن کھل جائے گا۔ یہی حال صاحب علم و عمل حق کا ہے۔ وہ زمان و مکان کا محتاج نہیں۔ جہاں کہیں جائے گا روشنی پھیلائے گا۔ جس جگہ سے گذرے گا، ہوا کی عطر بیزی بتلا دے گی کہ کوئی گذرنے والا یہاں سے گذرا ہے:

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

امام ابن تیمیہ کے تذکرہ میں بہت طول ہوگیا۔ بایں ہمہ جس قدر لکھا گیا، اُس سے کہیں زیادہ قابل ذکر امور چھوڑ دیئے گئے۔ حافظ ذہبی کو بھی ایسی ہی صورت پیش آئی تھی جن لفظوں میں انہوں نے معذرت کی تھی، میں بھی کروں گا" ومن خالطه وعرفه، قد ینسبنی الی التقصیر فیه۔ ومن نابذه وخالفه، قد ینسبنی الی التغالی فیه" قاله فی المعجم۔ یعنی جو لوگ امام ابن تیمیہ کے مقامات و مراتب کے جاننے والے ہیں، وہ تو مجھے الزام دیں گے کہ جس قدر مدح کرنی تھی نہ کی، اور جو بے خبر اور مخالف ہیں، وہ میرے بیان کو غلو و مبالغہ قرار دیں گے۔ انتہی۔ تلخیص:

اور ہمت و عزم کی جگہ ایک پہاڑ تھے۔ دل کی بیقراریوں نے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ مگر ہمت کی کوہ وقاری نے جہاں جایا، بغیر فتح و نصرت کے منہ نہ موڑا۔ ساتھ ہی علوم و عقائد کی تجدید و اصلاح کا عظیم الشان کام بھی اس اہتمام سے انجام دیا کہ بڑی بڑی جماعتوں سے بھی انصرام نہ پاتا۔ سب سے بڑھکر یہ کہ ابتداء خلقت سے دین حق کی وحدت، اصل شرع کے ہر حال و ہر شکل میں ایک ہونے، خیر القرون کے علم و عمل کی از سر نو تجدید، دین الخالص اور سنت خالصہ و محضہ کے اعتصام، اور تمام تفرقوں اور فرقہ بندیوں اور بدعتی راہوں کے خلاف قولاً و عملاً دعوت اولیٰ کی صدا اس قوت و نفوذ کے ساتھ بلند کی کہ وقت کا کوئی شور و غوغا اس پر غالب نہ آسکا۔ اور گو ہمیشہ بڑی بڑی قاہر و جابر کوششیں اُس کے خلاف کی گئیں، مگر اسکی گونج رہ رہ کر اٹھتی اور دب دب کر اُبھرتی رہی، حتیٰ کہ اگر آج بھی اگر مختلف گوشوں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں تو وہ بھی اُسی بازگشت کی گرج ہے۔ متنبی نے کیا خوب کہا ہے:

وما الدھر الا من رواۃ قصائدی　　اذا قلت شعرًا اصبح الدھر منشدًا

دشمنان حق کے پاس سب سے بڑا آلہ تعذیب قید خانے کی کوٹھریاں ہیں مگر یہ چیز بھی ان کی عزیمت دعوت کے مقابلہ میں بیکار تھی۔ مصر میں جب قید کرئے گئے تو تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ جب قلم دوات بھی چھین لی گئی تو قید خانے کے اندر قیدیوں پر نظر ڈالی۔ اُن کا بڑا حصہ ڈاکوؤں رہزنوں اور قاتلوں پر مشتمل تھا لیکن چند دنوں کے اندر انہیں شیطان سے فرشتہ بنا دیا۔ علم و عمل کی جو برکتیں خانقاہوں اور مدرسوں کو نصیب

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۵۔ کی بدگمانی علماء سوء کو ان کی مخالفت میں بڑی کامیابی اسی لئے ہوئی کہ پولٹیکل خطرہ دکھلا کر حکام وقت کو مخالف بنادیا۔ حافظ ابن حجر درر میں لکھتے ہیں "ونسبه قوم الی انه یسعی للامامة الکبری فانه کان یلهج بذکر ابن تومرت ویطریه، فکان ذلک مؤکدًا لطول سجنه" اور ابن کثیر لکھتے ہیں "ومن جملة اسباب جلسه ... [illegible] علیه طریقا من ذلک حتی للام أجلسه لذلک الما[illegible]

وعلم الدین برزالی وغیرہم مبتلائے محن ہوئے، شیخ نصر المنبجی صاحب خانقاہِ دمشق کا معتقد تھا۔ اسی شیخ نے بیبرس کو ابن تیمیہ کے خلاف بھڑکایا تھا۔ غرضکہ ملت و شریعت کی سیزدہ صد سالہ زندگی میں جو سخت سے سخت انقلابی زمانے گذر چکے ہیں، اُن سب سے زیادہ سخت و مہلک زمانہ تھا اور ایک انقلابی برزخ تھا کہ اصلاح کی تمام پچھلی قوتیں ختم ہو چکی تھیں اور فساد کے تمام تخم آئندہ کے لئے پھل پھول رہے تھے۔ وقت نہ تو بڑے بڑے مدرسوں کا طالب تھا نہ بڑی بڑی خانقاہوں کا، بلکہ صرف ایک ایسی زبان و قدم کے لئے تشنہ و بیقرار تھا جسمیں "عزم" ہو اور عازمانہ دعوت و امامت۔ سیکڑوں اعاظمِ وقت میں سے کسی کو بھی یہ منصب نہ ملا۔ امام ابن تیمیہ ہی تھے جو زمانے کو پلٹ دینے اور دلوں کو بدل دینے کے لئے اٹھے، اور ایک ہی وقت و زندگی میں وقت کی ہر طلب و سوال کا جواب دیا۔ تاتاریوں کے مقابلہ میں حفظِ ملت و بلاد کی ایک نئی زندگی بلادِ مصر و شام میں پیدا کر دی۔ علم ہی میں نہیں، بلکہ میدانِ جہاد و قتال میں بھی اُن کا گھوڑا سب سے آگے رہتا تھا۔ ذہبی نے کہا "اما شجاعتہ فبھا تضرب الامثال و بتشبہ اکابر الابطال۔ حتیٰ کانہ لیث حرب[1]" ایک صدی کے قتل و غارت نے تمام ملک کو جرأت و ہمت سے کورا کر دیا تھا۔ بے غیرتی و بزدلی سے سب کے دل مردہ ہو گئے تھے۔ مگر اب وہی آبادیاں تھیں جو خود منزلوں آگے بڑھکر تاتاریوں کا مقابلہ کرتیں اور یقین کرتیں کہ مسلمان اگر مسلمان ہو تو کوئی طاقت اُسے مغلوب نہیں کر سکتی۔[2] اُن کی زندگی کے حالات امام ذہبی کی زبانی سنو تو معلوم ہو کہ دل کی جگہ سیماب

(۱) ان کی شجاعت ضرب المثل ہے اور بڑے بڑے ہیروؤں کی شجاعت کے مشابہ ہے، وہ میدانِ جنگ میں شیر ببر معلوم ہوتے تھے۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ بالآخر وہ بھی اس فتنہ سے دوچار ہوئے جو اکثروں کو اس کام میں پیش آیا ہے۔ یعنی سیاسی دعوت اور سلطنت و امامت کبریٰ

(باقی بر صفحہ ۱۱۶)

کرگئی ہیں حتی کہ باب اجتہاد مسدود، اُن سب کا شیوع اور رواج اُسی زمانہ میں ہوا۔ تعلیم و تعلم کی تمام مجتہدانہ قوتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب صرف پہلے ذخیرہ کی مزید آرائش و تزئین میں ہمتیں مصروف تھیں۔ اسی چیز سے متون و شروح اور تلخیص و تعلیق وغیرہ کا طریقہ رائج ہوا جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ اس کے سوا اور تمام راہیں بحث و بیان کی بند ہو گئیں۔ مذہبی عہدوں کا ذریعہ صرف فروع فقہ کا علم تھا، اس لئے علوم دینیہ میں سے صرف اسی پر قناعت کر لی گئی۔ رفتہ رفتہ علوم اصلیہ قرآن و حدیث متروک و مہجور ہو گئے۔ یہ بات پہلے سے ہو چکی تھی (جیسا کہ امام غزالی وغیرہ نے تصریح کی ہے) لیکن اب بحد غایت پہنچ گئی۔ عملیات میں اہل کتاب اور عجمی اقوام کے اختلاط و امتزاج کا معاملہ آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس لئے بدع و رسوم کا فتنہ بھی اپنی پوری قوت اور احاطہ تک پہنچ گیا اور بڑے بڑے علماء کی نظریں اُس کے نفوذ و احاطہ کے اندر گم ہو گئیں۔ ایک بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر نازل ہوئی، تصوف حقیقی و صالح کے علم و عمل کا تنزل اور جہل و فسق کی کثافتوں سے اس جوہر کا امتزاج، اور اہل صلاح و طہارت کی جگہ خانقاہوں اور صومعوں کی عمارتوں کا پیدا ہو جانا ہے۔ یہ چیز اُس عہد میں پوری طرح نشو و نما پا چکی تھی۔ علی الخصوص دیار مصر و شام میں کہ بقیۃ السیف مسلمانوں کا مامن و ملجا رہے، صرف سی خانقاہوں اور خرقہ پوشوں کی شہنشاہی تھی۔ خود ملوک و سلاطین بھی انہی کے معتقد تھے اور حکومت کے زور سے ان کی بدعتیں اور جہالتیں پھیلاتے تھے۔ جس گروہ کے قبضہ میں وقت کا بادشاہ اور عوام کا غول ہو، اُس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ ملک بیبرس چاشنیگر جس کے عہد میں نہ صرف ابن تیمیہ بلکہ تمام ائمہ عہد مثلاً امام ابن دقیق العید و حافظ مزی

کمال و بلوغ کو پہونچے۔ علوم اصلیہ قرآن و حدیث کے ترک کی بنیادیں اسی عہد میں استوار ہوئیں۔ تقلید شخصی اور مذہبی فرقہ بندی کے التزام اور تعصب نے اسی زمانے میں پورا پورا زور پکڑا۔ تاتاریوں کو سب سے پہلی دعوت حنفیوں اور شافعیوں کے باہمی پیکار ہی نے دی تھی نومسلم حکمران مذہب و علم سے ناآشنا تھے، اس لئے مذہبی حکومت تمام تر علماء و فقہاء مذاہب کے ہاتھ آگئی۔ ہر مذہب کے لئے الگ الگ قاضی، الگ الگ مدارس، اوقاف، ائمہ جمعہ اور مذہبی عہدے قرار پائے۔ یہی چیز صدہا مفاسد و مصائب کا باعث ہوئی۔ ایک طرف علماء دنیا و فقہاء دولت یعنی ہندوستان کی موجودہ بول چال میں سرکاری علماء و مشائخ کا ایک گروہ عظیم پیدا ہوگیا (۱)۔ دوسری طرف باہمی تعصب و تفرقہ کی آگ روز بروز زیادہ بھڑکنے لگی۔ حتیٰ کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی اہمیت نہ دی تھی، ان کی بنا پر خواص فقہاء ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے، اور جس گروہ کو حکومت میں زیادہ دخل ہوا، اس نے دوسرے کو قید خانوں اور جلاوطنیوں کی مصیبت تک پہنچا کر چھوڑا۔ عوام کا فتنہ اسی زمانے میں اس درجہ تک پہنچا جہاں آج نظر آرہا ہے۔ شریعت کے اعتقاد و عمل کی ساری بادشاہی انہی کے ہاتھ ہے۔ جو بات چاہیں علماء سے کہلوا دیں، اور جو اپنے ہوائے نفس کے خلاف پائیں۔ اس پر اس قدر ہنگامہ مچائیں کہ کسی کو زبان کھولنے کی تاب باقی نہ رہے (۲)۔ علم و عمل کی وہ ساری بدعتیں جو آج مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت

---

(۱) یہاں اصل میں ایک حاشیہ تھا جسے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔

(۲) یہاں ایک حاشیہ تھا جسے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔

کے مناظر سامنے آتے۔ تم دیکھتے کہ اُس عہد کے تمام اصحاب فضل و کمال میدان عمل و دعوت میں کہاں تھے، اور یہ مجدد العصر کہاں تھا؟

تقدّم ﴿ اِنّا ﴾ فیھم اماما — ولولاہ لماذکروا وراثہ

ساتویں صدی کے اختتام اور آٹھویں صدی کے اوائل کا زمانہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی نازک اور انقلابی زمانہ تھا۔ مشرق میں عربی خلافت کا بکلی خاتمہ ہو چکا تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغ بھی بجھ چکے تھے۔ تاتاریوں کا سیلاب اپنی اصلی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا اور اب تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل رہا اور ہر کہنے اور ٹھہرنے کی جگہ ٹھہر رہا تھا۔ یہ وحشی درندے صرف تاخت و تاراج کے لئے آئے تھے، لیکن اب پچاس لاکھ مسلمانوں کے خون اور چھ صدیوں کے اسلامی تمدن کی ویرانی پر اپنی سلطنت کی عمارت تعمیر کر رہے تھے۔ ہلاکو کا پرپوتا اگرچہ مسلمان ہو گیا تھا، لیکن ابھی یہ تبدیلی محض برائے نام تھی۔ وحشت و خونخواری میں تمام تاتاری خصائل بدستور کام کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا کوئی مرکز باقی نہ رہا تھا۔ برسوں تک جمعہ کے خطبے کسی سلطان اسلام کے ذکر سے خالی رہے۔ اس عام بربادی نے مسلمانوں کی تمام اخلاقی قوتیں بھی فنا کر دیں۔ تاتاریوں کی ہیبت نے زندوں کو مردہ بنا دیا تھا۔ وہ صرف خون بہاتے اور نعشوں کے پل اور سروں کے منارے کھڑے کرتے۔ ایک چھوٹی سی ٹکڑی آبادیوں کی آبادیاں ذبح کر ڈالتی اور بادشاہوں اور فوجوں کو سر اٹھانے کی جرأت نہ پڑتی جب کوئی مرکز نہ رہا تو شریعت کا بھی کوئی محافظ نہ رہا، نہ امت کا کوئی رہبر۔ وہ سارے علمی و عملی مفاسد جو آج نظر آ رہے ہیں، یا تو اسی عہد میں پیدا ہوئے، یا ہو چکے تھے تو اسی عالم آشوبی میں

صاحب ردالوافر نے اُن کا قول نقل کیا ہے "اجتمعت فیه شروط الاجتهاد علی وجهها" اور "کان اذا سئل عن العلم ظن السامع انه لا یعرف غیر ذلک وکان الفقهاء من سائر الطوائف اذا جلسوا معه، استفادوا فی مذاهبهم" الخ۔ یعنی اجتہاد کی ساری شرطیں پوری طرح ابن تیمیہ میں جمع ہیں۔ ان کی ہمہ دانی کا یہ حال تھا کہ جس علم میں زبان کھلتی معلوم ہوتا اسی کے ماہر و امام ہیں۔ تمام مذاہب کے فقہاء ان کے گرد جمع ہوتے اور اپنے اپنے مذہبوں کے علوم و مسائل میں استفادہ کرتے۔ انتہیٰ۔

یہ ہے شہادت اُن کے مشہور مخالف و حریف کی، اور اسی سے اندازہ کرلو کہ جب مخالفوں کا یہ حال تھا تو دوستوں اور منزلت شناسوں کی وارفتگی کا کیا حال ہوگا؟ کیا خوب فرمایا قاضی عینی حنفی نے ردالوافر کی تقریظ میں کہ اگر اور کسی اہل علم کا اعتراف منقول نہ ہوتا تو صرف یہی ایک شہادت ابن تیمیہ کے کمال مرتبۂ علم و عمل کے لئے کفایت کرتی تھی:

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری!
ہنگامۂ صد سوختہ خرمن تبو گرم ست!

فصل

اور یہ جو کچھ لکھا گیا تو مقام تجدید و عزیمتِ دعوت کے صرف ایک ہی پہلو کی نسبت تھی، مراتب علم و نظر۔ لیکن یہاں کی سب سے بڑی آزمائش گاہ میدان عمل ہے۔ حقیقت بہت زیادہ واضح ہو جاتی اگر اُن کی حیات دعوت و اصلاح کے اعمال و اقدامات کے

دونوں مرتبہ وہی رئیس المناظرین تھے۔ حافظ ابن البلقینی لکھتے ہیں کہ جب ابن تیمیہ سے مناظرہ قرار پایا تو زملکانی کے سوا کوئی زبان نہ کھول سکا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:

"حتیٰ کان اشد المتعصبین علیہ والعاملین فی ایصال الشر الیہ هو الشیخ الزملکانی"

یعنی شیخ زملکانی نے سب سے زیادہ اُن کے خلاف اظہار تعصب کیا اور مضرت پہنچانے میں ساعی ہوئے۔ لیکن معلوم ہے۔ بایں ہمہ امام موصوف کے علم وعمل کی نسبت اُن کی رائے کیا تھی؟ حافظ ابن رجب طبقات میں اُن کا قول نقل کرتے ہیں (فیما احفظ عنہ)

"لم یر من خمسمائة سنة" پانچ سو برس سے ایسا باکمال دیکھا نہیں گیا! امام ابن تیمیہ کی ایک کتاب الدلیل علی بطلان التحلیل ہے۔ قاضی موصوف نے یہ کتاب اپنے قلم سے نقل کی جیسا کہ طباعت سے پہلے عام دستور تھا اور لوح پر لکھا من مصنفات سیدنا وشیخنا، وقدوتنا، الامام العالم العلامة الاوحد، البارع الزاهد الورع القدوة الکامل العارف سید العلماء، قدوة الائمة، حجة الله علی العباد، اوحد العلماء العاملین، آخر المجتهدین شیخ الاسلام" الخ حافظ سیوطی کی اشباہ والنظائر النحویہ چھپ گئی ہے۔ حرف "لو" کی بحث میں ابن تیمیہ کی ایک تحریر نقل کی ہے جو شیخ زملکانی کے خط سے منقول ہے شیخ موصوف ابن تیمیہ کی مدح میں کہتے ہیں:

ماذا یقول الواصفون له ؟	وصفاته جلت عن الحصر!
هو حجة لله قاهرة	هو بیننا اعجوبة الدهر!
هو آیة فی الخلق ظاهرة	انوارها اربت علی الفجر!

باکمال پیدا نہیں ہوئے۔ انتہیٰ[1] یہ ہے قاضی القضات تقی الدین سبکی کی شہادت امام ابن تیمیہ کی نسبت، جن کی مخالفت پر شیخ ابن حجر مکی اور اُن کے ہم مشربوں کو ناز ہے اور بار بار حوالہ دیتے ہیں کہ شیخ الاسلام سبکی نے انکار کیا، تو یہ ہیں شیخ الاسلام سبکی، اور وہ تھے ابن تیمیہ!

متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!

سچ ہے: "کمال" اور "حسن" ہی میں یہ اعجاز ہے کہ اگر تم پہاڑ کا جماؤ اور سمندروں کا طوفان بھی اپنے اندر پیدا کر لو، جب بھی اس کے سامنے ایک اڑتے ہوئے تنکے سے زیادہ وقعت نہ پیدا کر سکو گے۔ اگر تم اپنے سر کو جھکنے سے اور زبان کو بولنے سے روکو گے، تو سچائی کا فرشتہ اپنے آہنی پنجوں سے نہیں گرا دے گا اور حقیقت کا ہاتف تمہارے حلق کے اندر بیٹھ کر تمہاری زبان کو ایک مدہوش و بے اختیار آدمی کی طرح کھول دے گا۔ سچائی اپنی گواہی پتھروں سے مانگ لے سکتی اور درختوں کو بلوا کر دلا دے سکتی ہے تو انسان کی روح و زبان کب اس کے فرمان قضا سے باہر رہ سکتے ہیں؟ دنیا میں کامل طاقت اور بے باک حکم صرف سچائی ہی کو پہونچتا ہے۔ یا اُس کے دوسرے عرف میں کہہ سکتے ہیں کہ حسن کو اُس کے سوا اس کائناتِ جمال میں ہے کون؟

اے سنگ برتو دعوۂ طاقت مسلم است، خود را نہ دیدۂ بہ کف شیشہ گر ہنوز!

شیخ ابن حجر مکی اور دیگر مخالفین ابن تیمیہ قاضی سبکی کے بعد قاضی جمال الدین مالکانی کی مخالفت سے استدلال کرتے ہیں، سو بلاشبہ انہوں نے بھی سخت مخالفت کی۔

---

(۱) یہاں ایک طویل فٹ نوٹ تھا، تذکرہ میں ملاحظہ ہو۔

گفتی کہ چہ شد قاعدۂ مہر و محبت؟ رسمے کہ بود بعہد تو برافتاد!

جب قاضی موصوف امام ابن تیمیہ کی مخالفت میں غلو و تشدد کرنے لگے تو حافظ ذہبی نے ایک خط لکھکر ملامت کی۔ اس خط کے جواب میں معذرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں " واما قول سیدی فی الشیخ تقی الدین، فالمملوک یتحقق کبیر قدرہ وزخارۃ بحرہ، و توسعہ فی العلوم النقلیۃ والعقلیۃ، و فرط ذکائہ واجتہادہ، و بلوغہ فی کل من ذالک المبلغ الذی یتجاوز الوصف، والمملوک یقول ذالک دائماً، و قدرہ فی نفسی اکثر من ذالک، واجل مع ماجمعہ اللہ لہ من الزہادۃ والورع والدیانۃ ونصرۃ الحق والقیام فیہ لا لغرض سواہ، وجریہ علی سنن السلف واخذہ من ذالک بالماخذ الاوفی، وغرابۃ مثلہ فی ہذا الزمان بل من ازمان" حکاہ ابن حجر فی درر الکامنہ یعنی جو کچھ جناب نے شیخ تقی الدین۔ (ابن تیمیہ) کی نسبت لکھا ہے تو یقین کیجئے کہ یہ خادم اُن کی قدر و منزلت کی بزرگی، علم کی بے پایانی، علوم نقلیہ و عقلیہ میں وسعتِ نظر، کمال ذکاوت و اجتہاد، اور ان سارے اوصاف کمال میں وہاں تک پہونچ جانے کا معترف ہے جو حد توصیف سے باہر ہے۔ علی الخصوص ان اوصاف کے ساتھ اُنکا زہد و ورع اور دیانت و حق پرستی اور صرف اللہ کے لئے نصرت حق میں قیام و ثبات اور طریق سلف پر سلوک، اور موارد سلفیہ سے بحد کمال اخذ و نظر، اور بحیثیت مجموعی اُن کا وہ مرتبۂ کمال کہ موجودہ عہد میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ بلکہ کتنے ہی عہدوں سے ایسے

اہل علم اُن کے اشد شدید مخالف تھے، اور جن کی مخالفتوں سے اُس وقت کے علماء سوء وفقہاء دنیا و حکام جور کی فتنہ پردازیوں کو بڑی ہی تقویت پہونچی، خود اُن کے سروں کو بھی میدان خلاف و مخالفت سے باہر دیکھو گے تو امام موصوف کے سامان علم و عمل کے آگے عقیدت مندانہ جھکا ہوا پاؤ گے یہی مقام ہے جو دالعصر کا، اور یہی معنی ہیں کمال مرتبہ حسن وخوبروئی کے۔ صرف دوستوں ہی کی نظریں نہ الجھتی ہوں۔ ایک عیب ہیں دشمن بھی دیکھتے تو بے اختیار پکار اُٹھے دلستاں صورتیں اور صبر آزما چتونیں ایسی ہوتی ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں۔ حسن وہ ہے جس کا سوکنوں کو بھی اقرار ہو:

ومليحة شهدت لها ضراتها　　　والفضل ما شهدت به الاعداء[1]

امام ابن تیمیہ کے معاصرین میں سب سے زیادہ نام آور مخالف قاضی تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے مسئلہ زیارۃ وطلاق پر دو رسالے لکھے اور منہاج السنت کے متعلق ان کا قصیدہ مشہور ہے:

ان الروافض قوم لا خلاق لهم الخ

لیکن علماء سلف کی مخالفتوں کو اگر تم اپنی نفس پرستانہ و متعصبانہ مخالفتوں پر قیاس کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اُن کا بھی وہی حال تھا جو آج تمہارا ہے۔ تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ جہل و تعصب اگرچہ ہمیشہ دلوں پر حاکم رہے مگر علم والوں کا اخلاق ہمیشہ ایسا ہی نہیں تھا جیسا اپنا دیکھ رہے ہو:

---

(۱) حسینہ، جس کی گواہی اُس کی سوکنیں بھی دیتی ہیں، اور بڑائی وہی ہے جس کی گواہی دشمن تک دیں۔

غرضکہ آج بھی جبکہ بحکم بل قالوا مثل ما قال الاولون دورۂ فتن وکرۂ فساد پھر اسی نقطہ پر واپس آگیا ہے جہاں سے چلا تھا اور اس لئے تشکیکات وتدسیسات اور تلبیسات وتحریفات کے سارے فتنے بیک زمان وظرف جاگ اٹھے ہیں، جس طالب حق ویقین کو ہر طرف سے یاس وقنوط کا جواب مل چکا ہو، اور جس کسی نے قطع طریق میں اپنے رہنما کو خود گم کردۂ راہ دعقل باختۂ تلصص تشکیلات وتوسوس شبہات پایا ہو، آئے، اور ائمۂ حدیث واثر کے معارف وبراہین خالصۂ کتاب وسنت کا مطالعہ کرے اور دیکھ لے کہ اقوال وحالات مندرجۂ صدر کی سچائی اب بھی کیسی کھری اور غیر مبدل ہے؟ اور سرچشمۂ یقین وحکمت حاملین علوم نبویہ ہیں، یا مقلدین یونان وفرنگ؟ وما یستوی الاعمیٰ والبصیر، ولا الظلمات ولا النور، ولا الظل ولا الحرور، وما یستوی الاحیاء ولا الاموات ان اللہ یسمع من یشاء۔ وما انت بمسمع من فی القبور[1] (فاطر او الروم)

ستعلم لیلیٰ ای دین تداینت — وای غریم فی التقاضی غریمہا؟

فصل

اور امام ابن تیمیہ کی امامت وعلو مقام کی نسبت ائمۂ معاصرین کی جو شہادتیں نقل کی گئیں، تو یہ صرف ان کے موافقین ہی کا اعتراف نہیں ہے، بلکہ معاصرین میں جو بعض

(۱) بینا اور نابینا، اندھیریاں اور روشنی، چھاؤں اور دھوپ برابر نہیں، اور نہ زندے اور مردے برابر ہیں، خدا جسے چاہتا ہے بات سننے کی توفیق بخشتا ہے، تو انہیں اپنی باتیں نہیں سنا سکتا جو قبروں میں ہیں۔

امام نوادی کی شرح مسلم فروخت کردی اور اُس کی قیمت سے امام موصوف کی الرد علی النصاریٰ (جواب چار جلدوں میں چھپ گئی ہے) خرید کی۔ ایک شخص نے اس پر اعتراض کیا، تو کہا۔ میرے پاس شرح مذکور کے دو نسخے تھے۔ ایک فروخت کردیا۔ لیکن اگر ایک ہی نسخہ ہوتا جب بھی مصنفات ابن تیمیہ کے لئے بلا تامل فروخت کردیتا۔ کیونکہ "ما فی شرح مسلم اعرفہ و ما فی مولفاتہ انا محتاج الیہ" (کذا نقل عنہ فی الرد الوافی)

میں کہتا ہوں یہ بات آج بھی ویسی ہی سچی اور کھری ہے جیسی اُس وقت تھی، اور سچائی کی پرکھ یہی ہے کہ نہ تو کسوٹیوں کا بدلا جانا اُس کے لئے مضر ہے اور نہ زمانے کا بدلا جانا اُس کے کھرے پن میں شک ڈال سکتا ہے۔ زمانے کی لنبان خواہ کتنی ہی آگے کو بڑھجائے مگر یہ تو نہیں ہوسکتا کہ سونا پیتل ہوجائے اور کوئی چمکیلا ٹکڑہ سونا کہلانے لگے؛ فالحق ثابت والزمان یدور ویتغیر۔ آج بھی جبکہ دانش فروشی کے نشۂ باطل سے ہر نو خیز تکلم وکتابت سرگراں، اور بضاعتِ مُزجاتِ عقل ورائے کی نمود ونمائش سے ہر نو دولتِ تنک ظرف مخمور بالاخوانی ہائے لاف وگزاف ہے، اور فتنۂ ادعا مع الجھل وافتاء بغیر علم کی عالم آشوبی ہائے وقت ہم عنان رستخیز قیامتِ کبریٰ وہم دوش اشراطِ ساعتِ عظمیٰ ہے، اور ضلالت وبطالت لم ولا نسلّم وَاِعجابُ کلّ ذی رَایٍ برایہٖ ٹھیک اپنی اُس آخری حد تک پہونچ چکی ہے جس کی خبر اول روز ہی ایک حدیث قدسی میں دیدی گئی تھی، "ان امتک لا یزالون یقولون ما کذا؟ ما کذا؟ حتی یقولون ھذا اللہ خلق الخلق فمن خلق اللہ"[1]

(۱) تیری امت برابر کہتی رہے گی یہ کیسے ہے؟ یہ کیسے ہے؟ یہاں تک کہ کہیں گے اچھا یہ خدا ہے جس نے تمام مخلوق پیدا کی ہے، اور خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ (یہاں "تذکرہ" میں ایک حاشیہ ہے)

ابن تیمیہ علاوہ تفسیر القرآن کے چار ہزار صفحوں سے زیادہ ہیں، اور باوجود علماء، دولت اور سلاطین و حکام عہد کی شدید مخالفتوں کے آج کتب فروشوں کے چبوتروں پر سب سے زیادہ مانگ اُنہیں کی ہے۔ شیخ ابن یوسف مرعی لکھتے ہیں۔ بلاد مصر و شام کے سیاح جب یمن و نجد کی طرف جاتے ہیں تو بہترین تحفہ جو اُن سے اہل علم طلب کرتے ہیں، امام موصوف کی مولفات ہیں۔ اُن کی زندگی ہی میں یہ حال تھا کہ بڑے بڑے اکابر علم ائمہ سلف کی کتابیں فروخت کر ڈالتے تاکہ مولفات ابن تیمیہ خرید سکیں۔ قاضی القضاۃ شام شیخ شہاب الدین ملکاوی الشافعی (جو فقیہ الشام کے قلب سے مشہور ہوئے اور امام ابو العباس ابن حجی کے شیوخ درروایت میں سے ہیں۔ کماذکرہ فی المعجم) اُنہوں نے

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰۳

دمشق میں صدا اٹھی: ھٰکذا یکون جنائز اہل السنۃ! اور چین میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی زبان سے بے اختیار نکلوا دیا: الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن! یعنی ان کی تمام حیات علم و عمل کا خلاصہ قرآن و سنت تھا، تو بحکم حدیث صحاح "انتم شھداء اللہ فی الارض" اللہ نے انسانوں کی زبانی جو کچھ کہلوایا، اُس میں بھی اور کوئی وصف نہ تھا صرف اسی بات کی شہادت تھی کہ سنت کا اہل اور قرآن کا ترجمان و مفسر تھا۔ یہی چیز ہے کہ انکے بڑے بڑے معاصرین کو سب کچھ ملا تھا مگر یہ نہیں ملی تھی، اور ہمیشہ صرف مجدد العصری کے حصے میں آتی ہے، اگرچہ قید خانے میں اس نے زندگی بسر کی ہو یا سولی کے تختے پر ختم کی ہو، اور اگرچہ تمام دنیا والوں نے اُس کی تحقیر و مخالفت کیلئے ایکا کر لیا ہو، اور تمام روئے زمین کے بادشاہوں نے اُس کی عظمت کو شکست دینے کے لئے اپنی کمریں باندھ لی ہوں۔ ع لقد احسن القائل:

در غالبین کاسہ رنداں بخواری منگرید
کیں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند
قدسیاں بے بہرہ اند از جرعۂ کاس الکرام
ایں تطاول بیں کہ با عشاق مسکیں کردہ اند

مصنفات سیاح و نو آباد عربوں کے ذریعہ چین تک پہونچ چکی تھیں[1]۔ اُن کی وفات کے تقریبًا پچاس ساٹھ برس بعد حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ میں نے شمار کیا تو مشہور مولفات

---

(۱) حافظ ابن رجب طبقات میں لکھتے ہیں "صلی علیہ صلوٰۃ الغائب فی الغالب بلاد الاسلام القریبۃ والبعیدۃ۔ حتی فی الیمن والصین۔ و اخبر المسافرون أنہ نودی باقصی الصین للصلاۃ علیہ یوم جمعۃ۔ الصلاۃ علی ترجمان القران!" یعنی امام ابن تیمیہ نے جب وفات پائی تو اکثر بلاد اسلام میں اُن کے لئے نماز جنازہ غائب پڑھی گئی، حتی کہ یمن اور چین میں۔ اور سیاحوں کی زبانی معلوم ہوا کہ چین کے نہایت بعید گوشوں میں جمعہ کے دن منادی کرنے والے نے پکارا "ترجمان القرآن کے لئے نماز جنازہ پڑھی جائے گی!" امام موصوف سے ساٹھ ستر برس بعد ابن بطوطہ نے چین کا سفر کیا تھا۔ اُن کو موجودہ شہر پیکن کے قریب قبائل عرب و تجار اہل اسلام کی ایک بہت بڑی نو آبادی ملی تھی جس میں فقہا و محدثین و اصحاب درس و تدریس موجود تھے شیخ بدر الدین محدث نے اُن کی دعوت کی۔ اس کے علاوہ عام دیار چین میں بھی ہر جگہ عرب اور نو مسلم بہ تعداد کثیر موجود تھے، اور بلاد عربیہ سے آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ پس انہی لوگوں نے امام موصوف کی خبر وفات سن کر نماز جنازہ پڑھی ہوگی۔ اور یہ جو لکھا ہے کہ: "نودی باقصی الصین" تو اس سے مقصود اندرون چین کی وہی نو آبادی ہوگی جو موجودہ شہر پیکن کے قریب ابن بطوطہ کو ملی تھی۔ اور پھر غور کرو یہی وہ خصائص مقام عزیمت دعوت کے ہیں جن میں آوروں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اگرچہ بظاہر کتنا ہی پایہ بلند رکھتے ہوں۔ خود امام موصوف تو قید خانے کی کوٹھری میں محبوس و مظلوم انتقال کرتے ہیں۔ لیکن ان کیلئے نماز جنازہ چین میں پڑھی جاتی ہے اور اُن کی زندگی ہی میں ترجمان القران والسنت ہونے کی شہرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ چین کی دیواروں سے جا ٹکراتی ہے اور پکارنے والا پکارتا ہے "الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن" حافظ برزالی لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کے بعد اور کسی کے جنازہ پر خلق اللہ کا اس قدر اجتماع نہیں ہوا نہ اتنی نمازیں پڑھی گئیں جس قدر امام ابن تیمیہ کے جنازہ پر۔ حالانکہ ان کا جنازہ قید خانے سے نکلا علاوہ خلیفہ متوکل امام احمد کا معتقد تھا۔ مگر سلطان عہد ابن تیمیہ کا مخالف۔ وکان یومًا مشہودًا۔ جب جنازہ اٹھا اور انبوہ کا یہ حال ہوا کہ صرف عورتوں کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ اندازہ کی گئی تو ایک شخص نے منارہ مسجد سے ندا دی: ھٰکذا یکون جنائز اھل السنۃ! سبحان اللہ یہ مقام وراثت تامہ نبوت کا

ویستمسك با وضع برھان" الخ۔

حاصل دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ ہم سے متعدد علما, وافاضل نے ذکر کیا کہ انہوں نے متکلمین کے اقوال و مقالات میں غور وخوض کیا تھا، تاکہ حق وصواب معلوم کریں، لیکن ان میں سے ہر شخص کا یہ حال ہوا کہ جس قدر اس میدان میں بڑھتا گیا، اتنی ہی زیادہ حیرانی وگمراہی سے اپنے تئیں نزدیک پایا۔ ارباب کلام واصول کے اقوال وعقلیات میں سے کوئی بات بھی ایسی نظر نہ آئی جو بنیادِ حق کو استوار کرتی اور دل کو اُس پر اطمینان وقرار ملتا۔ حتیٰ کہ اُن کی حالت سخت مخدوش ہوگئی اور اپنے ایمان ویقین کی طرف سے خوف پیدا ہوگیا کہ کہیں تشکیک و انکار کی گمراہی میں ڈوب جائیں۔ لیکن جب اللہ نے اُن پر احسان کیا اور امام ابن تیمیہ کے مولفات کے مطالعہ کی توفیق بخشی تو اُن کی ہر بات عقل سلیم کے مطابق پائی اور وہ تمام پردے شک وریب کے ہٹ گئے جو متکلمین کے قیل وقال نے اُن کی بصیرت پر ڈال دیئے تھے۔ اگر کسی شخص کو اس بات کی صحت میں شک ہو تو امام موصوف کی مولفات آج بھی موجود ہیں حسد وتعصب سے خالی ہوکر اُن کا مطالعہ کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ واللہ وہ حق ویقین اور طمانیتِ قلب پائے گا، اور دلائل واضحہ وبراہین قاطعہ کا عروۃ الوثقیٰ اُس کے ہاتھوں میں ہوگا۔ انتہیٰ۔

خود امام موصوف کی زندگی ہی میں اُن کی مصنفات کے اس خاصہ کی شہرت یہاں تک عالمگیر ہو چکی تھی کہ مصر وشام وعراق کے کتب فروش ائمۂ سلف کی کتابوں سے زیادہ اُن کی مصنفات کے نسخے رکھتے تھے۔ اُن کی زندگی ہی میں اُنکی

مفتاح دارالسعادت، دیباچۂ نونیہ، والصواعق المرسلہ، وغیر ذلک۔ تو یہ مقبولیت بلاو
نہیں ہے۔ اسی لئے ہے کہ اس خطبہ کے ہر جملہ میں ایک دفتر معارف پوشیدہ ہے۔ از انجمہ
یہ کہ فرمایا "یشھب الحق قد ر موہ" تو یہ وہی بات ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے
فرمائی تھی "ارموہم بالسنت" (رواہ الدارمی) ارباب بدع وہوا پر سنت کے تیر چلاؤ
اس کی روک کے لئے اُن کے پاس کوئی ڈھال نہیں۔ اور اسی لئے اہل بدعت کی ایک پ
یہ ہوئی کہ ہمیشہ قرآن کے نام کی آڑ پکڑیں گے (کلمۃ حق ارید بہا الباطل) اور سنت
وماثور سے اعراض کریں گے "علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال
فاحلوہ" الخ۔ تو سنت واسوۂ حسنہ کے تیروں کی بارش سے اُن کے منہ پھیر د
"ما اتاکم الرسول فخذوہ" اور "حتی یحکموک فیما شجر بینہم" اور "من اطاعنی ف
اطاع اللہ" کے بے خطا ہتیاروں سے اُن کا مقابلہ کرو۔ اور یہ جو فرمایا "وشمہ
قتیل لابلیس قد احیوہ"۔ تو یہ وہی حقیقت ہے کہ کمال اتباع وتفانی فی السنت ک
سے اُن پر معالجۂ نفوس وتداوی امم کی راہیں کھول دی جاتی ہیں، اور وہ صرف ایک ہی نسخۂ ا
وسنت ہاتھ میں لے کر تمام بیماران قلب وناخوشان روح کو دعوت شفاء دیتے ہیں۔ یہ
کہ منجملہ اسماء وصفات قرآنیہ کے ایک اسم وصفی "الشفاء" بھی قرار پایا کہ دل اور یقین
سارے دکھوں کے لئے بجز اس کے اور کسی میں شفاء طمانیت نہیں: قل ھو للذین آمنوا ھ
وشفاء والذین لایومنون فی اذانہم وقر وھو علیہم عمی۔ اولئک ینادون من مکان

---

(۱) کہدے وہ ایمان والوں کے لئے ہدایت وشفا ہے، اور جو ایمان نہیں رکھتے اُن کے کانوں میں
اور وہ اُن پر نابینائی ہے، وہ (گویا) بڑی دور جگہ سے پکارے جاتے ہیں۔

خالی ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ بھٹکے ہوؤں کو راہ ہدایت کی طرف بلاتے ہیں، کور چشمانِ ظلمت کی آنکھیں نورِ الٰہی سے روشن کر دیتے ہیں، کتاب و سنت کی روحِ حیات سے جہل مردی اور غفلت کی نعشیں جلا دیتے ہیں۔ اور اس کام میں اہل جہل و ضلالت کے ہاتھوں جس قدر بھی اذیتیں پہونچتی ہیں۔ اُن پر صبر کرتے ہیں۔ پھر کتنے ہی ابلیسِ جہل کے مارے ہیں جو اُن کی مسیحائی سے جی اُٹھے! اور شیطان و شک و ریب کے تیروں کے زخمی ہیں جنہیں اُن کے دستِ شفا سے یقین کا مرہم اور ایمان کی اکسیر ملی! بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لگا دیا۔ بدعت کے لشکروں اور احداث و تحریف کی پلٹنوں کو قرآن و سنت کے تیروں کی بوچھار سے تتر بتر کر دیا۔ گمراہی کے جھنڈے اُن کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ اور فتنوں کی صفیں اُن کے قشونِ دلائل اور جنودِ براہین کے فاتحانہ حملوں سے الٹ گئیں۔ انتہی ملخصاً۔[1]

حضرت امام اہل السنت کا یہ خطبہ باوجود اختصار کچھ ایسا جامع واقع ہوا ہے کہ بڑے بڑے اکابر و اعلام کی زبانوں کو خود بخود چڑھ گیا۔ اور انہوں نے ساری خطب او فواتح اور عبارہ مطالع چھوڑ کر انہی چند تبرک جملوں پر اقتصار کر لیا۔ بظاہر یہ مقبولیت خطبات ماثورہ و مطالع شہیرۂ خلفاء راشدین کے بعد اور کسی مصنف کے کلام کو نہیں ملی۔ وھذا من خصائصہ رضی اللہ عنہ۔ حافظ ابن مندہ اپنے اکثر خطبات اسی سے شروع کرتے۔ حافظ ابن جوزی کا ذکر اُن لوگوں میں ہیں جنہوں نے خطبات وعظ مجامع کو ایک فن بنا دیا، قاعدہ تھا کہ اپنے اکثر مواعظ اسی خطبہ سے شروع فرماتے۔ حجۃ الاسلام حافظ ابن قیم تو اس کے ایسے شیفتہ ہوئے کہ اپنی اکثر کتابیں اسی سے شروع کرتے ہیں مثلاً

(۱) یہاں ایک حاشیہ تھا، "تذکرہ" میں دیکھو۔

اور انک لتهدی الی صراط مستقیم[1] کے ساتھ وما انت بمسمع من فی القبور[2] اور سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم[3] بھی موجود و معلوم ہے۔ دوا بیمار کو کھلائی جاتی ہے اگرچہ جانکنی میں مبتلا ہو۔ لیکن ایک ٹھنڈی لاش کے لئے بقراط و جالینوس کی ساری مسیحائیاں بھی بیکار ہیں۔ یہی وہ حقیقت مقام امامت فی الدین کی ہے جو طبابت و مداوی امراض یقین کی نظری و عملی قوت کی راہ کھولدیتی ہے، اور اسی کی طرف امام اہل السنت حضرت احمد بن حنبل نے اپنے نامۂ وصیت بنام مسدد بن مسرہد کے خطبہ میں اشارہ کیا تھا کہ "الحمد للہ الذی جعل فی کل زمان بقایا من اهل العلم، یدعون من ضل الی الهدی، ویبصرون بنور اللہ اهل العمی، ویحیون بکتابه الموتی، وبسنة رسوله اهل الجهالة والردی، ویصبرون منهم علی الاذی، فکم من قتیل لابلیس قد احیوه؟ وکم من ضال لا یعلم طریق رشده قد هدوه؟ وکم من مبتدع فی دین اللہ بشهب الحق قد رموه؟ فما احسن اثرهم علی الناس! ینفون عن دین اللہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین، الذین عقدوا الویة البدعة، واطلقوا اعنة الفتنة، مختلفین فی الکتاب، ویقولون علی اللہ وفی اللہ۔ تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا، انتهی ما نقله الحافظ ابن الجوزی فی سیرته۔ یعنی امت محمدیہ کا کوئی زمانہ نہیں جو اہل العلم کے بقایا سے

---

(۱) البتہ تو سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ (۲) جو قبروں میں ہیں تو انہیں سنانے کا نہیں۔

(۳) تو ڈرائے یا نہ ڈرائے ان کے لئے برابر ہے۔

کی صداقت پر:

این دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند!

حتیٰ کہ اگر تاریخ شریعت کے تمام وسائل معدوم ہو جائیں، اور روایت و حکایت کے تمام صحائف سے قطع نظر کر لیا جائے، جب بھی صاحب شریعت کے وجود و سیرت کی تاریخی حقیقت اُسی طرح روشن و بیّن باقی رہے، جس طرح تاریخی و روایت کے دفاتر میں ہے، اور اگر دنیا چاہے تو اُس کی پوری تاریخ حیات صرف ایک کتاب اللہ کی لوحِ محفوظ اور کتاب قیّم ہی سے مرتب کرے!

فصل

اور یہ معاملہ صرف شیخ عماد الدین واسطی ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ کے برکات امامت کے اس فیضان جاری و ساری کا اُن کے تمام معاصرین محققین نے خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ آج بھی اُن کے علوم و معارف سنت کی اس خاصۂ عظیمہ کا ہر وہ شخص اور جماعت تجربہ کر سکتی ہے جو شک کی بیماریوں سے مایوس اور یقین کی محرومیوں سے لب مرگ ہو اور جس کو حدیثِ نفس[1] اور وہم خاطر فاتر کے زخموں نے چور چور کر دیا ہو۔ البتہ ہر حال میں طلب صادق شرط ہے، اور جاحد و الد الخصام مریض نہیں ہے جس کے لئے کوئی نسخہ مفید ہو سکے۔ وہ اموات و قبور میں داخل ہے جن کا معاملہ علاج سے باہر ہو چکا،

(۱) یہاں ایک طویل اور عجیب حاشیہ تھا جسے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ "تذکرہ" میں دیکھو۔

اور شرح سراپا کہا، تو قطع نظر فسحتِ میدان اشارات کے، ویسے بھی یہ کیوں موجب قدح وشک ہو؟ حق یہ ہے کہ "قرآن" اور "صاحب سنت" کی باہمی یگانگت واتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر بھی کہا جائے، اُس سے بہت کم ہے جس قدر کہنا چاہیئے۔

وللہ در ما قال:

ما شئت قل فیه، فانت مصدق　　　فالحب یقضی والمحاسن تشهد(۱)!

بلکہ اس مقام پر حق تو وہ ہے جو شیخ ابن الفارض نے کہا۔ طلب اللہ مضجعہ:

وعلی تفنن واصفیه بوصفه　　　یفنی الزمان وفیك مالم یوصف!

وقال ایضاً رحمه الله:

اری کل مدح فی النبی مقصراً　　　وان بالغ المثنی علیه واکثر

اذا الله اثنی بالذی هو اهله　　　علیه، فما مقدار ما یمدح الوری!

اور اگر خاص طور پر اس معاملہ کو دیکھا جائے تو فی الحقیقت یہ چیز بھی منجملہ خصائص قرآن وصاحبِ قرآن کے ہے۔ آج تمام ادیان حاضرۂ عالم میں کوئی دین بھی ایسا نہیں جس کی کتابِ الٰہی اور صاحب وحامل کتاب کے باہمی علاقہ، وحدت کا یہ حال ہو۔ اور دونوں میں سے ہر وجود ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ وملحق اور باہمدگر شاہد ومشہود کا تعلق رکھتا ہو کہ کتاب، حامل کتاب کی صداقت پر دلیل وشاہد ہو، اور حامل کتاب، اصل کتا

---

(۱) اُس کے بارے میں جو چاہو کہو، تمہاری تصدیق کی جائے گی، کیونکہ محبت فیصلہ کے لئے بیٹھی ہے اور خوبیاں گواہی کے لئے کھڑی ہیں!

نہ آئے، لیکن حال یہ ہوگا کہ گویا تمام انبیاء و مرسلین کے مراتب و کمال میں سے ایک ایک فرد کا ذکر کر دیا گیا، اور وہ سب کچھ آگیا جو اُن کے بارے میں کہا جا سکتا تھا۔ جب باغ و چمن کا نام لیا تو گو تم نے نہ پھولوں کا نام لیا ہو نہ اُن کی رنگت و بو کا، نہ نہروں کا ذکر کیا ہو نہ اُنکی نضارۃ و روانی کا، لیکن خود بخود ان سب کا ذکر آگیا، اور جب تم نے کہا تختۂ گل، ہوائے عطر بیز نظارۂ انہار و اشجار، بنفشہ و سنبل و یاسمن، تو اب تم باغ و چمن کا نام لو یا نہ لو، مگر اس کا نام تو تم نے اُن ناموں میں سے ہر نام کے ساتھ لے ہی لیا، اور گو بظاہر ذکر بنفشہ و سنبل اور اشجار و انہار کا تھا مگر فی الحقیقت ذکر ان سب کا نہیں بلکہ صرف ایک ہی حقیقت جامعہ تھا۔ یعنی باغ و چمن کا۔ مولانا کے اشارات اس مقام کی نسبت از بس لطیف و پر ذوق واقع ہوئے ہیں۔ از انجملہ کیا خوب فرمایا:

نام احمد نام جملہ انبیاست ... چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست

جب "سو" کہدیا تو اب ایک سے ننانوے تک جو کچھ ہے سب آگیا۔ اور جب کہا ایک۔ دو۔ دس۔ پچاس۔ تو فی الحقیقت ذکر "سو" ہی کا ہوا۔ قرآن حکیم میں یا احکام ہیں، یا مواعظ و حِکَم ہیں، یا شرح قوانین ہدایت و ضلالت، اور یا پھر قصص الاولین۔ تو معلوم ہے کہ اگر احکام ہیں تو اُسی شریعت کے جس کا حامل سید المرسلین ہے۔ مواعظ و حکم ہیں تو وہی ہیں جن کی عملی تصویر اُسوۂ کاملۂ وجود سید المرسلین ہے۔ قصص ہیں تو اُنہی فضائل و مراتب کے جو سب کے سب مرتبۂ جامعیت محمدی میں بوجہ اتم و اکمل جمع ہو گئے۔ پس اگر حضرات صوفیائے کرام نے تمام قرآن کو اسی ایک حسنِ اکمل اور جمالِ بے ہمتا کی حکایتِ شمائل

اور ہم رنگ و ہم معنی اشکال و صور ہیں، اور اس لئے باہم دگر اشباہ و نظائر کا حکم رکھتے ہیں، بحدیکہ بوجہ کمال اشتراکِ صورت و معنی اگر ایک کڑی ہٹا دی جائے تو دوسری ٹھیک ٹھیک اُس کی جگہ پڑ جائے، اور معلوم ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی یعنی وجود مقدس حضرت خاتم الادیان و مکمل الشرائع و متمم النعم ساری پچھلی کڑیوں کا جامع، اور اسی لئے بحکم "انا سید ولد آدم" اور "لو کان موسیٰ حیًا ما وسعہ الا اتباعی" اور نص قرآنی کہ "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس"(۱) اور "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی"(۲) الخ اور "فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شہیدا"(۳) (نساء) منتہائے مرتبۂ سیادت و قیادتِ عالم، و مرکزیتِ رسل و شرائع، و افضلیت کلی نوعی سے فائز و ممتاز ہے:

بہ طرازندگی قامت موزوں نازم

یک قبا نیست کہ شائستہ اندام تو نیست!

تو لامحالہ باب فضائل و مقامات اور قصص و حکایتِ ایام میں جو کچھ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے، یا جو کچھ صدق لسان و تحقیق کے بیان کے ساتھ اس بارے میں کہا جائے گا، وہ گو بلاواسطہ دوسروں کی حکایت ہو، مگر بالواسطہ متعلق اسی وجود اجمع و اکمل سے ہوگی۔ اور جب کبھی خاص اس وجود جامعیت کی نسبت کچھ کہا جائے گا، تو گو اس میں دوسروں کا ذکر لفظاً

---

(۱) تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے اٹھائے گئے ہو (۲) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی الخ (۳) اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر گروہ میں سے ایک گواہ لائینگے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے؟

عہ یہاں ایک فٹ نوٹ تھا جسے چھوڑ دیا ہے۔

پیش کیا ہے اور نہایت کثرت کے ساتھ اُن کی سیرت وسوانح اور وقائع وایام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق وسوابق کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے۔ اور بسا معامات میں ایسا بھی ہے کہ :

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

کا معاملہ ایک کیفیت خاص اور لذتِ اشارات کے ساتھ اصحابِ نظر وذوق کیلئے قُرَّۃ عیون اور سرور انفس وقلوب کا حکم رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عرفا و اصحاب اشارات نے کہا۔ بائے بسم اللہ سے سین والناس تک جو کچھ ہے، گو حکایت موسیٰ کلیم کی ہو اور یوسف صدیق کی (صلوٰۃ اللہ علیہما) لیکن اُن سب سے مقصود ایک ہی ہے، اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر روئے سخن اُسی طرف ہے :

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود !

اور اُردو میں کسی نے خوب کہا ہے :

نام اُن کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں !

والکنایۃ ابلغ فی الذمن التصریح :

خوش دلکش ست قصۂ خوبان روزگار　　　　تو یوسفی و قصۂ تو احسن القصص !

اور اگر اس بات کو باب اشارات سے باہر بھی دیکھا جائے، جب بھی اِسکی صداقت میں کلام نہیں۔ جب تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا وجود اصلاً ایک ہی اصل وحقیقت پر مبنی اور تمام مقاصد و اعمال ووقائع میں جزاً وکلاً ایک ہی سلسلۂ بعثت کی مختلف کڑیاں

زیادہ روشن و محکم ہے۔ اور اگر یقین کے لئے یہ دلیل کافی نہیں تو پھر اس دنیا میں یقین کا وجود ہی نہیں حتیٰ کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کا بھی نہیں۔ اگر تم کہتے ہو کہ دنیا میں صرف وہی باتیں ماننی چاہیئے جو "یقینی" ہوں اور "ثابت" شدہ ہوں۔ یعنی تم اعتقاد کے لئے صرف "امکان" کافی نہیں سمجھتے۔ "اثبات" کے طلبگار ہو، تو جب بھی دنیا میں "الکلم الطیب" اور "العمل الصالح" سے بڑھکر اور کون سی ثابت و واقع حقیقت ہوسکتی ہے؟ خود تمہارا وجود اور اثبات "انا" بھی اس سے زیادہ ثابت و مشہود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا دعوت الی الوحی کو "قول الثابت" اور "دین القیم" اور "الواقع" اور "الثالث" وغیرہا سے تعبیر کیا ہے گو لوگ دوسری چلے گئے۔ بہر حال حضرت نوح کا وجود بجائے خود ایک دلیل و اثبات ہے۔ حضرت ابراہیم اپنی ذات کے اندر خود ایک حجت قائمہ و آیۃ کاملہ ہیں۔ حضرت موسیٰ کی پوری زندگی صرف اس ایک لفظ میں تبلادی جاسکتی ہے: برہان محکم و دلیل ثابت۔ اور اسی طرح تمام انبیاء و مرسلین اور بوجہ ان کی تبعیۃ و معیتہ کے تمام نفوس صادقۂ بشر من الصدیقین و الشہدا و الصالحین کی زندگیاں اور زندگی کے تمام وقائع و اعمال بجائے خود ایک مستقل دلیل و برہان حق ہیں۔ اور اس طرح ہر نبی کا تنہا وجود سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم ان کا استشہاداً و استدلالاً ذکر کرتا، اور ان کو "آیۃ" اور "بینۃ" سے تعبیر کرتا، اور اس طرح گویا ہر ایک تذکرہ و حکایتِ حیات نبوت میں دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے۔ علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو بطور ایک مستقل دلیل و شاہد ثابت کے

قرآن متن ہے اور سیرت اُس کی شرح۔ قرآن علم ہے اور سیرت اُس کا عمل، قرآن صفحات و قراطیس مابین الدفتین اور فی صدور الذین اوتو العلم ہے؛ اور یہ ایک مجسّم و ممثّل قرآن تھا جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قال الصدیقۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا "وکان خلقہ القرآن"

ما دو جانے آمدہ در یک بدن | من کیم؟ لیلیٰ، و لیلیٰ کیست؟ من!

انبیاء کرام کی زندگی سے بڑھکر "یقین" اور "ایمان" کی پکار اور کیا ہوسکتی؟ محال قطعی ہے۔ کہ ایک صاحبِ استعداد سیرت نبویہ کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا ٹکڑہ بھی پیش نظر رکھتا ہو اور پھر شک و اضطرابِ نفس کا افسونِ ہلاکت اُس پر کارگر نہ ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا انبیاء کرام علیہم السلام کی نفس زندگی و وجود کو بطور ایک حجت و برہان کے پیش کیا ہے۔ نہ کہ محض بطور قصص اور انباء بالغیب کے جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔

قرآن حکیم کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی اور جو کچھ اُس پر گذرا اور قولاً و فعلاً جو کچھ اُس سے تعلق رکھتا ہے، ان میں سے ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور برہان حق ہے، اس سے بڑھکر اس حقیقت کے اثبات کے لئے اور کوئی دلیل یقینی و قطعی نہیں ہوسکتی کہ خدا ہے، اور ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے اور اُس نے جسطرح عالم ہستی اور ما فیہا کو بنایا، اُسی طرح اُس کے لئے قوانین و نوامیس عمل و نتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں۔ دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے اُن کے یقینی ہونے کو مانتا ہے، قرآن کی دلیل نبی کی طرح قطعی اور سب سے

وصلاح کیلئے ایک اشارۂ حقیقت کافی ہے۔ واما الذین فی قلوبھم مرض[1] تو نکیلئے حقائق ومعارف کے قناطیر مقنطرہ بھی بیکار ہیں۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہیں گے۔ ماذا اراد اللہ بھذا مثلا[2]؟

وما احسن وما اصدق ما قال العرفی الشیرازی:

ہزار معجزہ بنمود عشق وعقل وجہول ہنوز رامت اندیشہ ہائی خوشتین است!

فصل

غرضکہ امام ابن تیمیہ نے ایک ایسی حقیقت جو طبیعت کو جو ارباب ظن ورائے کی صحبتوں سے وادی شک واضطراب میں حیران وسرگرداں ہوگئی تھی، اُن ساری باتوں میں ایک بات بھی نہیں کہی جو اور لوگ کہہ سکتے تھے، بلکہ صرف یہ وصیت کی کہ سیرت طیبۂ نبویہ کا مطالعہ کرو یہی نسخۂ شفا شک وریب کے سارے دُکھوں کا ایک ہی علاج ہے، اور پھر قولاً بھی اپنی تمام مصنفات میں اسی چیز کو بنیاد علم وایقان بتلاتے ہیں، تو یہ بات بھی منجملہ اُنہی خصائص مقام وراثت نبوت کے ہے کہ:

علیم بادواء النفوس یسوسھا بحکمۃ فعل الطبیب المجرب!

اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے، صاحب کی سیرت وحیات مقدس کے مطالعہ سے بڑھکر نوع انسانی کے امراض قلوب وعلل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرۃ ہے، اور دراصل قرآن اور حیات نبوت معنیً ایک ہی ہیں۔

---

(۱) جن کے دلوں میں بیماری ہے (۲) اس مثال سے خدا کا کیا مراد ہے؟

وغیرذلک من الآیات فی هذ الباب۔ اور فی الحقیقت یہی وہ نورِ حقیقت اور مشکوٰۃ فیت ہے جس کو ایک عجیب و غریب اور جامع و مانع تمثیل مرکب میں واضح فرمایا: مثل نورہ کمشکوٰۃ فیہا مصباح۔ المصباح فی زجاجۃ۔ الزجاجۃ کانہا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ، لا شرقیۃ ولا غربیۃ۔ یکاد زیتہا یضئ ولو لم تمسسہ نار۔ نور علی نور۔ یہدی اللہ بنورہ من یشاء ویضرب اللہ الامثال للناس۔ واللہ بکل شیئی علیم[1] (نور) اور یہ مقام مجملہ روح الروح معارفِ کتاب و سنت و حقیقۃ الحقائق قرآن و شریعت کے ہے جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے مگر اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ تفسیر البیان میں ایک سے زیادہ مواقع پر اس کی تشریح و توضیح ملے گی، اور اس سے بھی زیادہ مقدمۂ تفسیر موسوم بہ "البصائر" میں بہ عنوان حقیقتِ ایمان و کفر۔ بااین ہمہ ابتک طبیعت اس طرف سے سیر نہیں ہوئی: روز بروز یہ مقام اپنی مزید وضاحت اور وسیع تر اطراف و مباحث کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہے۔ شاید دامن بیان اس سے بھی کہیں زیادہ پھیلے جس قدر البیان میں سمٹا جا چکا ہے۔ مہذا ارباتی ق

---

(۱) اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے، طاق میں چراغ رکھا ہے، چراغ شیشے کی قندیل میں ہے اور قندیل اس قدر شفاف ہے گویا موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارہ ہے، چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے کہ جو نہ پورب کے رخ واقع ہے نہ پچھم کے رخ، اُس کا تیل ایسا ہے کہ اگرچہ اس کو آگ نہ بھی چھوئے تاہم معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے آپ جل اُٹھے گا، نورٌ علی نور، اللہ اپنے نور کی طرف جسے چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرما[illegible] اور اللہ [illegible] آگاہ ہے۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون ؟ انما یتذکر اولوا الباب[1]

(زمر) غرضکہ جس کا حال یہ ہو کہ و ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی[2] اُنکا سا

نہ ہو کہ یجادلون فی ایات اللہ بغیر سلطان (مومن) اور بغیر علم ولا ھدی

ولا کتاب منیر (حج) تو کیا صرف وہی اکیلا نہیں ہے جس کی راہ دنیا کے لئے امن و سلامتی کی

راہ ہے اور جس کے ساتھیوں کے لیئے نہ تو کبھی شک کی بے چینی ہے نہ جہل و ظلمت کا ہراس:

لا یمسنا فیھا نصب و لا یمسنا فیھا لغوب[3] یہی معنی ہیں ان آیات کریمہ کے او من

کان میتا فاحییناہ و جعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمات

لیس بخارج منھا[4] ؟ (انعام) اور افمن یمشی مکبا علی وجھہ اھدی من یمشی

سویا علی صراط مستقیم[5] ؟ (ملک) اور افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام

فھو علی نور من ربہ فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ[6] (زمر)

---

(۱) بھلا جو شخص رات کے اوقات میں بندگی میں لگا ہے، کبھی سجدہ کرتا ہے کبھی کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید کرتا ہے (کہیں وہ نافرمانوں کے برابر ہو سکتا ہے) اے رسول کہدے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں، عقلمند ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔

(۲) وہ اپنے دل سے نہیں کہتا، وہ جو کچھ کہتا ہے وحی ہوتی ہے جو اُس پر آتی ہے۔

(۳) اس میں ہم کو نہ کسی طرح کی تکلیف پہونچتی ہے اور نہ کسی طرح کا تکان لاحق ہوتا ہے۔

(۴) کیا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اُسے جلایا اور ایک نور بخشا جس سے وہ لوگوں میں چلتا ہے، اُس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا؟

(۵) کیا وہ جو اپنا منہ اوندھائے ہوئے چلتا ہے، زیادہ رو براہ ہے یا وہ جو سیدھا راہ راست پر چلتا ہے؟

(۶) کیا وہ شخص جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے (اُس کے برابر ہو سکتا ہے) جو کفر کے اندھیرے میں پڑا ہے؟ پس ہلاکت ہے اُن کے لئے جن کے دل ذکر الٰہی کی طرف سے سخت ہو گئے ہیں؟

جمالك في عيني وحبك في قلبي — وذكرك في فمي، فاين تغيب[1]؟

تم نے اپنی درماندگیوں سے عاجز آکر اس کا نام ہی مافوق ادراک اور غیب رکھدیا ہے حالانکہ یہاں تو اسکی مشہودیت کا یہ حال ہے کہ اس کا ذکر ہی "شہادت" کے لفظ سے کیا جاتا ہے جس کے معنی حضور و رویت کے ہیں: شهد الله انه لا اله الا هو والملائكة واولوا العلم قائما بالقسط[2] (عمران) تم اس کی طلب و جستجو کو گمان و خیال اور قیاس و ظن سے تعبیر کرتے ہو کہ اس سے آگے تمہارا قدم نہیں بڑھتا: ذلك ظن الذين كفروا حالانکہ یہاں ظن و گمان کا کیا ذکر؟ ظن کو تو یہاں زندگی (ہدایت) کے دائرے ہی سے خارج اور موت (کفر) کا ہمنشین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو اس کی نسبت جو کچھ کہا اور سمجھا جاتا ہے، اس کا نام ہی "ایمان" اور "ایقان" ہے۔ یعنی عدم شک اور یقینِ صرف و بحت: يقولون ربنا آمنا فاكتبنا مع الشاهدين ومالنا لا نؤمن بالله وما جاءنا من الحق ونطمع ان يدخلنا ربنا مع القوم الصالحين[3]! (مائدہ) امن هو قانت آناء الليل ساجدا وقائما، يحذر الآخرة ويرجو رحمة ربه،

---

(۱) تیرا حسن میری آنکھوں میں ہے، تیرا عشق میرے دل میں ہے، تیرا ذکر میرے منہ میں ہے، پھر تو کہاں غائب ہو سکتا ہے؟

(۲) اللہ نے گواہی دیدی ہے اور اس کے ملائکہ نے اور اہل علم نے کہ بجز اس کے کوئی معبود نہیں (اور وہی) عدل کے ساتھ قائم ہے۔

(۳) وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے پس ہمیں شاہدین کے گروہ میں لکھ، اور ہم کیوں نہ اللہ پر اور اس حق [illegible] ایمان [illegible] طمع کریں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں کے زمرہ کے ساتھ کردے۔

فی عرض هذا الحائط وانا اصلی" (بخاری) اور حدیث اسماء بنت ابی بکر اور خطبۂ صلوۃ کسوف کہ "ما من شیئ لم اَرہ الا وقد رأیتہ فی مقامی ھذا حتی الجنۃ والنار، واوحی الیّ انکم تفتنون فی القبور"[2] الخ رواہ البخاری اور "ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی"[3] رواہ الاربعۃ۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ "اتانی ربی فی احسن صورۃ[4] (وفی روایۃ اتانی اللیلۃ ربی) فقال فیم یختصم الملاء الاعلیٰ فقلت لا ادری۔ فوضع کفہ بین کتفی حتے وجدت بردا نا ملہ بین ثدیی وتجلی لی علم کل شیٔ" اخرجہ جماعۃ منھم احمد والترمذی وصححوہ۔ جس حقیقت ہزار حجاب کا ایک سچا یا کم از کم سچائی سے قریب تصور بھی تم سے بن نہ آیا، میں نہ صرف اُس کا سراغ ہی رکھتا ہوں، بلکہ وہ تو میری دیکھی بھالی اور میرے سامنے کی مشہود و منظور ہے "حتی وجدت بردا نا ملہ بین ثدی"! اُس کی انگلیوں سے چھونے کی ٹھنڈک اپنے سینہ پر محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اور کیا رہ گیا؟

---

(۱) قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ابھی ابھی اس دیوار پر میں نے نماز پڑھتے ہوئے جنت اور دوزخ دیکھی ہے۔

(۲) جو کچھ میں نے نہ دیکھا تھا وہ سب ابھی یہاں دیکھ لیا حتی کہ جنت اور دوزخ بھی، اور تمہارے رب نے مجھے وحی کی ہے کہ لوگوں کی قبروں میں آزمائش کی جائے گی۔

(۳) میں اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

(۴) میرا رب میرے پاس بہترین صورت میں آیا اور فرمانے لگا کہ بتا ملاء اعلیٰ میں کس بات پر تکرار ہو رہی ہے؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا، اس پر اُس نے اپنی ہتھیلی میری پیٹھ پر رکھی یہاں تک کہ اُس کی انگلیوں کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینہ میں محسوس کی، اور ہر چیز کا علم مجھ پر کھل گیا۔

(ج) یا پھر اُس کا ساتھ دینا اور بلاچون وچرا سمع والطاعت کا سر جھکا دینا چاہئے جس کی ساری پکار اور سارے پیاموں کی بنیاد ہی یہ ہے کہ میں ظلمت نہیں سرتا سر نور ہوں۔ میں تاریکی میں اِدھر اُدھر بھٹکنے والا اقدام اور خود اپنے ہاتھ کو بھی نہ دیکھ سکنے والی آنکھ نہیں ہوں، بلکہ معرفت و شہادت کا اُجالا ہوں، نورانیت میں بے خوفِ لغزش و بے خطرۂ گمراہی قدم ہوں، اور دوپہر کی چمکیلی روشنی میں ایک ایک ذرہ تک دیکھ لینے اور پالینے والی بینائی ہوں" السمحة الحنفية والمحجة البيضاء. ليلها كنهارها[1]" یہاں ظلمات بعضها فوق بعض کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یمین ویسار، بالا و پست، اور بین یدیہ وخلفہ بجز نور اور نورٌ علیٰ نور کے اور کچھ نہیں ہے۔ وکان من دعائہ صلعم باللیل "اللھم اجعل فی قلبی نورًا وفی لسانی نورًا، واجعل فی سمعی نورًا، واجعل فی بصری نورا، واجعل من خلفی نورًا، ومن امامی نورًا، واجعل لی من فوقی نورًا، ومن تحتی نورًا، اللھم اعطنی نورًا[2]" (مسلم) نہ میری حقیقت میں آنکھ کے لئے زیغ ہے، نہ منزل شناس قدم کے لئے ٹھوکر: مازاغ البصر وما طغیٰ۔ لقد رای من ایات ربه الکبریٰ[3]۔ اور حدیث انس کہ "والذی نفسی بیدہ لقد عرضت علی الجنة والنار آنفا

---

(۱) آسان دین حنیف اور صاف شفاف راہ، اُس کی رات بھی اُس کے دن کی طرح روشن۔

(۲) رسول اللہ صلعم رات میں یہ دعا مانگا کرتے تھے: خدایا! میرے دل میں نور ہو، میری زبان میں نور ہو، میرے کانوں میں نور ہو، میری آنکھوں میں نور ہو، میرے آگے نور ہو، میرے پیچھے نور ہو، میرے اوپر نور ہو، میرے نیچے نور ہو، خدایا! مجھے نور ہی نور عطا فرما"

(۳) [illegible] اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

کہ خود اپنا ہاتھ بھی سوجھائی نہیں دیتا۔ ایک گتھی سلجھانا چاہتا ہے تو دس نئے الجھاؤ رشتۂ ادراک میں پڑ جاتے ہیں: کظلمات فی بحر لجی یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضہا فوق بعض، اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور(۱) (نور) اور جس کی اُن ساری کوششوں اور طلب جستجو کا جو حقیقت تک پہونچنے اور عقدۂ ہستی حل کرنے کے لئے کرتا ہے، یہ حال ہے کہ ہر نیا مرحلہ ایک نئی گمرہی کا پیام اور ہر نئی منزل ایک نئے بعد و گم گشتگی کی مایوسی ہے۔ جس نظریہ پر رُکتا اور فاتح کار سمجھکر پوجتا ہے، جب اُس تک پہونچتا ہے تو یقین کی جگہ ایک نئے شک کی دعوت نکلتی ہے، اور جواب کی جگہ وہ خود ایک نیا سوال ہوتی ہے، اور اس طرح اُس کی ساری امیدیں اور ساری خوشیاں اُس پیاسے کی امید سے زیادہ ثابت نہیں ہوتیں جو ریگستانِ افریقہ کو دجلہ و فرات سمجھکر بے تحاشا دوڑ رہا ہو: کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماء، حتی اذا جاءہ لم یجدہ شیئاً(۲) (نور)، پس کیا کھوئے ہوؤں کو طلبِ دلیل و ہدایت میں اپنے ہی جیسے کھوئے ہوؤں کا دامن پکڑنا چاہیے؟ ضعف الطالب والمطلوب(۳) (حج) اور لبئس المولیٰ ولبئس العشیر(۴)

---

(۱) مانند تاریکیوں کے ایسے بحر زخار میں جس میں ایک موج پر دوسری چڑھ رہی ہو اور اوپر بادل چھائے ہوں، تاریکیوں پر تاریکیاں! اگر آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو نہ دیکھ پائے، جس کے لئے خدا نے نور نہیں کیا اُس کے لئے کوئی نور نہیں۔

(۲) جیسے چلکتی ہوئی ریت چٹیل میدان میں کہ پیاسا اُسے پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اُس کے پاس آتا ہے تو اُسے کچھ بھی نہیں پاتا۔

(۳) طالب اور مطلوب دونوں کمزور (۴) کارساز بھی برا اور رفیق بھی برا۔

نوعِ بشر کو یہ کہکر بلارہا ہو: ھذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی اور تمام منکرین وجاحدین سے بار بار مطالبہ کرتا ہو: ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا؟ یعنی علم ویقین اور خروج من ظلمات الجھل الی نور المعرفۃ والحقیقۃ کی راہ ہے جسکی طرف میں تمہیں بلارہا ہوں پھر تمہارے پاس بھی کوئی "یقین" اور "علم وبصیرت" ہے جسے دنیا کو آگے پیش کرسکتے ہو؟ فھل یستوی الاعمیٰ والبصیر؟ اور وھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون[1]؟ ایک کہتا ہے میرے پاس شک ہے، اگر تم میری طرف آؤ، تم کو شک سے معمور کردونگا۔ دوسرا کہتا ہے میرے پاس جو کچھ ہے بجز یقین اور برہان کے اور کچھ نہیں۔ لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ تنزیل من حکیم حمید (حم سجدہ) اور بل ھو اٰیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (عنکبوت) میں بصیرت ہوں۔ دعوتِ علم ہوں۔ پیامِ حجت وبرہان ہوں۔ حقیقت جو ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتی، اُس کی ایک ہی راہ ہوں۔ اقوم الطرق، اوضح السبل، صراط السوی: ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہٖ[2]۔ پھر بتلاؤ، دنیا کو جو طمانیت واقرار کی بھوکی پیاسی اور شک واضطرابِ نفس کے زخموں سے جاں بلب ہے، کس کا ساتھ دینا چاہئے؟ اُس کا ساتھ دینا چاہئے جو خود شک وفریب کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ایک تاریکی سے نکلنے کے لئے دوسری تاریکی میں ڈوبتا ہے، اور تاریکیوں کو اپنا حال کہتا ہے؟

(۱) کیا بینا اور نابینا برابر ہیں؟ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟

(۲) میری یہ راہ سیدھی ہے پس اسی پر چلو اور راستوں پر نہ چلو کہ تمہیں خدا کے راستے سے بھٹکا دیں۔

طلبِ مرض کو طلبِ شفا سمجھا ہے، اور سمِّ قاتل سے امیدِ حیات رکھی ہے! اور پھر یاد رہے کہ یہی معنی ہیں سلف کے اس قول کے کہ علم نہیں ہے مگر وہ جس میں حدثنا اور اخبرنا ہو۔ یہاں مقصود علم سے علم مصطلحۂ شرع ہے نہ کہ لغت۔ کما قال الشافعی رضی اللہ عنہ:

کل العلوم سوی القران مشغلة ۔۔۔ الا الحدیث ولا الفقہ فی الدین[1]

العلم ما کان فیہ قول حدثنا ۔۔۔ وما سوا ذالک وسواس الشیاطین[2]

اور یہی معنی ہیں اِس قولِ نبوی صلعم کے کہ علم صرف تین ہیں۔ ماسوا ان کے جو کچھ ہے فضل ہے۔ آیۃ محکمۃ، سنۃ قائمۃ، فریضۃ عادلۃ۔ اور یہ منجملہ جوامع الکلم نبویہ کے ہے۔ وقدس اللہ روح القائل وھو حجۃ الاسلام ابن قیم اذ یقول فی النونیۃ الکبریٰ:

العلم قال اللہ قال رسولہ ۔۔۔ قال الصحابۃ ھم اولو العرفان[3]

ما العلم نصبک للخلاف سفاھۃ ۔۔۔ بین الرسول وبین رای فلان[4]

کلا ولا عزل النصوص وانھا ۔۔۔ لیست تفید حقایق الایمان[5]

اذ لا تفید کم یقیناً لا، ولا ۔۔۔ علماً، فقد عزلت عن الایقان[6]

---

(۱) قرآن، حدیث اور تفقہ فی الدین کے سوا تمام علوم خدا سے غافل کرنے والے ہیں۔

(۲) علم وہی ہے جس میں "حدثنا" آئے (یعنی علم حدیث) اس کے سوا جو کچھ ہے شیطان کا وسوسہ ہے۔

(۳) علم وہی ہے جو اللہ کا قول ہے، اُس کے رسول کا قول ہے، صحابہ کا قول ہے کہ جو حقیقتاً اہل معرفت تھے۔

(۴) علم یہ نہیں ہے کہ تو حماقت کی راہ سے رسول کے مدمقابل زید، عمر، بکر کی رائے کھڑی کرے۔

(۵) ہرگز نہیں، اور نصوص شرعیہ کا معطل کر دینا کہ جس سے ایمان کے حقائق حاصل نہیں ہو سکتے۔

(۶) کیونکہ اگر ان نصوص سے تمہیں علم یقینی حاصل نہیں ہوتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ یقین دلانے کے منصب کی اہل نہیں رہیں۔

زہر مرض کہ بنالد کسے، شراب دہید!

باقی یا تو اسماء مختلف ہیں اور مسمیٰ وہی ایک ہے۔ مثلاً "سنت، وسیرت" کی جگہ "قرآن وکتاب" کا لفظ بولدیا جائے کہ نام دو ہوگئے مگر حکایت شہد وعسل سے زیادہ نہیں۔ دلالت وتسمیہ میں تعدد ہوا۔ نہ کہ مدلول ومسمیٰ میں۔

عبارا تنا شتے وحسنک واحد!

یا پھر اسی نسخہ کے اجزاء وتوابع جیسے آثار وسیرت صحابہؓ وسلف امت کہ گو اشکال واسماء میں تفرقہ وامتیاز ہوا، مگر بحکم "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" اور "وآخرین منہم لما یلحقوا بہم" اور "فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیہم الخ" اور "ما انا علیہ واصحابی" معنیً وحکماً جزء وکل، اصل وفرع، مصدر ومشتق، یا شمس وکواکب کا سا معاملہ واقع ہوا ہے۔ روشنی صرف ایک ہی ہے اور ایک ہی کی ہے۔ اگرچہ چاند سے بھی مل جائے اور چمکیلے ستاروں سے بھی:

بحر لیست متحد کہ باشکال مختلف — باران وقطرہ وصدف وگوہر آمدہ
مشتق چو نیک درنگری عین مصدر ست — کیں در صفات ظاہر خود مضمر آمدہ

ویقرب من ھٰذا ما قیل بالعربیۃ:

وما البحر الا الموج لا شئ غیرہ — وان فرقتہ کثرۃ المتعدد!

اور اگر یہ دونوں صورتیں بھی نہیں، تو پھر جو کچھ ہے، نہ تو عرفان ہے نہ شفا، بلکہ خود جہل ہے

"نا آگ" اس دنیا میں زیادہ جسمانی مریضوں کا بستا ہے جنہوں نے ہمیشہ

ففیہ ما تشتہیہ الانفس و تلذ الاعین:

سرِ خدا کہ عارف و زاہد کسے نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!

فصل

بہرحال اس واقعہ میں قابل غور وہ عشق و شیفتگی ہے جو امام موصوف کو خصوصیت کے ساتھ سیرت نبویہ سے تھا۔ ایک سرسری نظر رکھنے والا تو اس واقعہ کو معمولی سی بات سمجھکر سرسری طور پر آگے بڑھجائیگا۔ لیکن صاحب نظر و بصیرت اسی ایک بات سے امام موصوف کے تمام علوم و اعمال کا محور و مرکز معلوم کر سکتا ہے۔

انہوں نے ایک ایسے صاحب علم مگر مریض شک و اضطراب کو جو مدعیان علم و حکمت کی دانش فروشیوں کے ہاتھوں اپنا یقین و اطمینان ضائع کرچکا تھا، یہ وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف حیات طیبۂ نبوت کے مطالعہ و تفکر میں لگ جاؤ گویا اس طرح بتلادیا کہ علم و بصیرت کا سرچشمہ حیاتِ نبوت اور منہاج مقامِ رسالت ہے۔ جس کو قرآن حکیم نے "الحکمۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا[1] یہی "خیر کثیر" مبدء جمیع خیرات و برکات ارض و نوع ہے، اور صرف اسی نسخۂ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دور ہو سکتی ہیں۔ خواہ شکوک و ارتیاب کی بیماری ہو خواہ اوہام و انکار کی۔ خواہ ادعاء ادریت کا ہیجان ہو خواہ حیرانی و سرگردانی لاادریت کا خما

(۱) جسے حکمت ملی ہے اُسے بہت بھلائی بھی مل گئی ہے۔

وتوضیح ہوچکی ہے، اس موضوع پر بعض دیگر تالیفات بھی پیش نظر ہیں۔ لیکن ابھی یہ کس کو معلوم ہے کہ یہ تمام اوراق پریشان جن کو بلا فکر مآل و مستقبل لکھتا جاتا ہوں، اور (بقول ابن تیمیہ) اُس شخص کی طرح جو اپنے آتش زدہ مکان کا سامان جلد جلد کھڑکی سے باہر پھینک رہا ہو، باوجود ہجوم نوازل، وانبوہ زلازل، واحاطۂ حوادث، وتشتتِ بال، و بے سروسامانی حال جس قدر بھی فراغ خاطر ساتھ دیتا ہے، صحبت قرطاس و قلم و تسوید واردات وافکار میں کمی نہیں کرتا، کبھی جمیعت و ترتیب اور صورت انطباع و اشاعت بھی نصیب ہوگی یا نہیں؟ البتہ مزدور کا کام محنت ہے، اور چاکر کا کام چاکری۔ بعد کی فکر نہ ہم کو کرنی چاہئے اور نہ کرنے سے کچھ حاصل:

کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند!

شیخ واسطی نے امام موصوف کے جو اشارات متکلمین وارباب تاویل کے باب میں نقل کئے ہیں، اُن کو زیادہ تفصیل کے ساتھ اُنہوں نے اپنے مشہور مقالہ عقیدۃ الحمویہ میں لکھا ہے۔ یہ وہی تحریر ہے جس کی بنا پر سب سے پہلے امام موصوف کے خلاف علماء سوء نے فتنہ اٹھایا اور ربیع الاول ۶۹۸ھ میں مبتلائے محن و آلام ہوئے۔ یہ رسالہ مصر میں دو بار چھپ چکا ہے۔ علامہ سفارینی نے کہ گیارہویں صدی کے کبار اصحاب اثر و اعاظم حماتِ طریق سلف میں سے ہیں، ایک ضخیم مجلد میں اُس کی شرح بھی لکھی ہے، اور اُن طالبانِ حق و جویان حقیقت کے لئے جن کے امراض قلب و اعتقاد کو علامہ نسفی و تفتازانی و دوانی (رحمہم اللہ) کے شفاخانوں [illegible] اعظم و تریاق مجرب و شفاء لما فی الصدور کا حکم رکھتی ہے

بہرحال اصحاب تاویل ورائے اور متکلمین واتباع فلاسفہ کی بے حاصلی ونامرادی، اور سلف اُمت واصحاب تفویض کے مذہب حق وطریق حکمت اور عقلیات صادقہ کے اثبات وتصرت میں امام ابن تیمیہ کے مباحث ومقالات اور براہین قواطع کا عالم ہی دوسرا ہے، اور افسوس امت کی محرومی وواماندگی پر کہ صدیوں سے یہ خزائن معارف وکنوز حقایق موجود ہیں مگر کوئی اُن کا شناسا وعارف پیدا نہ ہوا۔ ہمیشہ غفلت وجہل اور تعصب وجمود کی تاریکیوں میں مدفون ومجہول رہے۔ وھٰذہ لیست اول قارورۃ کسرت فی الاسلام۔ وکم من نوبۃ قد رموا الحق والعلم عن قوس واحدۃ! علی الخصوص آجکل مسلمانوں میں جس فتنۂ عقائد نے سر اٹھایا ہے، اور بحکم بل قالوا مثل ما قال الاولون[1] وہ تمام فتنے اکٹھے ہوکر پلٹ آئے ہیں جو عقاید اسلامیہ کے مختلف دوروں میں فرداً فرداً ظاہر ہوئے تھے، اس کے لحاظ سے تو معارف ابن تیمیہ سے بڑھکر اور کوئی چیز مطلوب ومقصود وقت نہیں۔ البتہ ضرورت بہت کچھ اضافۂ مطالب، وتفصیل اجمال، وتوضیح اشارات، وضبط وتالیف اشتات وانتشار کی ہے، اور اس کا بہترین محل وموقعہ امام ابن تیمیہ اور اُن کے اصحاب وتلامذہ کی سیرت میں مل سکتا ہے۔ اس چیز کا خیال عرصہ سے تھا۔ لیکن یہ سطور لکھتے ہوئے بے اختیار اس کام کی طرف دل مائل ہورہا ہے۔ اگر تفسیر کے سلسلے سے ذرا بھی مہلت نکلی تو انشاء اللہ سیرت ابن تیمیہ کی ترتیب پر متوجہ ہونگا۔ باقی رہا اصل مبحث تو الحمد للہ تفسیر البیان میں بہ تحت سورۂ بقرہ نہایت شرح وبسط سے لکھا جاچکا ہے، اور جستہ جستہ دیگر مقامات تفسیر میں بھی اسکی تحقیق

---

(۱) جیسا اگلوں نے کہا تھا ویسا ہی اُنہوں نے بھی کہا۔

کا جملہ اُس پر صادق آئے، تو یہ فضل مخصوص صرف امام موصوف اور اُن کے اصحابِ تلامذہ ہی کے حصہ میں آیا۔ اسی لئے امام ذہبی نے کہا "لقد نصر السنۃ المحضۃ والطریقۃ السلفیۃ واحتج لہا ببراہین ومقدمات وامور لم یسبق الیہا واطلق عبارات احجم عنہا الاولون والآخرون"[1] اور اسی لئے اُن کا مرتبۂ تجدید اور فاتحیت تمام مجددین وفاتحینِ اعصار اوائل و اواخر میں سب سے بالاتر و ارفع واقع ہوا۔ کیونکہ اکثر مجددین امت کی تجدید دعوت متعلق اعمال و فروع کے ہے، لیکن امام موصوف کی تجدید براہِ راست علوم و عقائد اصول و اساسات شریعت سے متعلق ہوئی۔ پس جو نسبت اصل و فرع میں ہے، وہی نسبت اُن کے مرتبۂ تجدید اور مجددین متاخرین اُمت کے مراتب میں سمجھی جاہئے۔ اسی لئے گو اُن کا دور متاخرین میں ہوا، لیکن بہ لحاظ مرتبۂ معنویہ کے داخل صفوف اوائل و اسلافِ اُمت و مصداق صحیح و آخرین منہم لما یلحقوا بہم ہوئے۔ اور پھر اسی لئے سلسلۂ اصلاح و تجدید اُمت میں اُن کی دعوت خلف کے لئے واسطۃ العقد کا برزخ واقع ہوئی جو خلف کو سلف سے جوڑتی اور اواخر پر اوائل کے فیضان و برکات کا دروازہ کھولتی ہے۔ وما احسن ما قال الشیخ بدر الدین بن عز الغنیمی فی رثائہ رحمۃ اللہ علیہما:

فلئن تأخر [illegible] ... فلقد تقدم فی العلوم امام[2]

---

(۱) انہوں نے سنت اور طریق سلف کی نصرت و حمایت کی اور ایسے دلائل و براہین و مقدمات سے کام لیا کہ کسی کی سوچ بھی وہاں تک نہ پہنچی تھی، اور ایسی عبارتیں استعمال کیں کہ اگلے پچھلے ان کے استعمال سے جھجکتے تھے۔

(۲) اگر ان کا زمانہ پیچھے کا تھا تو [illegible] میں نہیں ہوئی بلکہ آخری صدی میں پیدا ہوا ہے تو اس کی [illegible] علوم میں آگے کا امام ہے۔

سارے پردے شکوک، واضطراب کے اُٹھ گئے، اور میرے دل نے حلاوتِ ایقان وطمانیت کی لذت پائی۔ میرا دل بے اختیار پکار اٹھا جس نورِ حقیقت کی جستجو میں سرگردان وحیراں ہو رہا اُس کی شعاعیں امام ابن تیمیہ کے ناصیۂ امامت پر چمک رہی ہیں۔ جب وہ میرے حالات پر مطلع ہوئے تو وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف سیرت نبویہ کے مطالعہ اور تدبّر و تفکر کو اپنے اوپر لازم ٹھہرالو۔ یقین اور ایمان کی تمام بیماریوں کے لئے یہی ایک نسخہ کافی ہے۔ چنانچہ میں نے یہ وصیت حرزِ جان بنائی، اور جو کچھ پایا اسی کے وسیلہ سے پایا۔

شیخ موصوف نے صرف سیرت طیبہ کے مطالعہ ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کمالِ شغف وربطِ قلب سے اس باب میں بعض مفید تالیفات بھی کیں۔ ازاں جملہ سیرت ابن اسحاق کا خلاصہ ہے جس کی حافظ ذہبی نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ گو یا خود اُس کا تہذیب ابن ہشام ہے لیکن حسن تبویب و اضافۂ فوائد کے لحاظ سے مستحق ترجیح ہے۔

فصل

شیخ عماد الدین واسطی (رح) نے امام موصوف کی جس صحبت کا ذکر کیا ہے تو یہ صحبت منجملہ اُن اہم ترین مباحث شریعت اور دقیق ترین معارف کتاب سنت کے ہے جن کی کشف و تحقیق اور بحث و تنقیب امام ابن تیمیہ کے حصے میں آئی۔ حقیقت اگرچہ سلف کے یہاں حالاً و عملاً بحد کمال موجود تھی، لیکن قولاً و علماً اُس کو منتہا درجۂ بحث و تحقیق تک پہنچا دینا اور بطریق جوامع و قواعد اُس کا اثبات کرنا اور اس درجہ منقح و صاف کر دینا کہ لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً

اور کہا کہ بعض دفعہ اپنی مدت العمر کے قیل وقال اور کیف ولماذا کا حاصل یہ تبلایا ہے (درآ
اشعار بالا شہرستانی کے اور آتیہ امام رازی کے ہیں!

نہایۃ اقدام العقول عقال　　　واکثر سعی العالمین ضلال[1]

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　　سوی ان جمعنا فیہ قیل وقالوا[2]

آخر میں ایک ایسے قاطع وارفع طریق سے جو سارے شکوک مٹا دینے والا اور ساری پیچیدگیوں
نجات دلا دینے والا تھا ثابت کیا کہ جن لوگوں نے اپنی محرومی ومحجوبیت اور کوری ومجہولیت
پر خود یہ کچھ شہادتیں دی ہیں، بھلا ان کی پیروی سے کب باب معرفت تک رسائی ہو سکتی ہے؟
قلت وما احسن قول الشاعر العارف:

آں لعل گراں بہا ز کان دگر است　　　واں در یگانہ را نشانے دگر است

اندیشۂ ایں واں خیال من وتست　　　افسانۂ عشق را بیانے دگر است۔

پس حقیقت وہی ہے جس کو وحی الٰہی اور حاملین منصب نبوت اور ان کے اصحاب واتباع نے
دنیا کے آگے پیش کیا، اور شک وظن کی ظلمت ومحجوبیت کی جگہ علوم سماویہ ونبویہ کی یقینیات
وبراہین کا دروازہ نوع انسانی پر کھول دیا، اور جس کے علم وعمل کا نمونہ سلف صالح وادائل
امت مرحومہ تھے۔ من السابقین الاولین من المہاجرین والانصار والذین اتبعوہم
باحسان رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ شیخ موصوف کہتے ہیں۔ اس ایک ہی صحبت میں

---

(۱) معقولات والوں کو تحیر میں بیڑیاں ملتی ہیں اور دنیا کی اکثر کوششیں گمراہی ہوتی ہیں۔

(۲) [illegible] صرف یہ پایا کہ لوگوں کا قیل وقال جمع کر لیا۔

حافظ ابن کثیر (صاحب تفسیر) نے اپنی تاریخ کبیر "البدایۃ والنہایۃ" میں انہی شیخ عماد الدین واسطی کی نسبت لکھا ہے کہ ابتدا میں اُن کا مسلک دوسرا تھا۔ پھر دوسرا ہی رنگ چڑھ گیا۔ اس تبدیلی کا باعث صرف امام ابن تیمیہ کی ایک صحبت ہوئی۔ اُن کی نشوونما فقہا و متکلمین کی جماعت میں ہوئی تھی اس لئے جدل و خلاف اور کلام و رائے کا اثر غالب تھا۔ مصر سے بغداد گئے تو وہاں خیالات میں توسیع ہوگئی اور اپنی حالت کا محاسبہ کیا تو یقین و طمانیہ سے قلب خالی پایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقہاء و متکلمین کے طریق سے دل برداشتہ ہوگئے اور تصوف کی طرف توجہ ہوئی، لیکن عامہ متصوفین کی صحبتوں کا جو رنگ ڈھنگ نظر آیا، اُس سے طبیعت اور زیادہ مکدر ہوگئی۔ بالآخر دمشق آئے اور امام ابن تیمیہ کی صحبت میں داخل ہوئے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ صحبتِ درس میں حاضر ہوا تو عجیب اتفاق ہے کہ علم کلام ہی کی نسبت صحبت تھی۔ امام موصوف فرما رہے تھے "دنیا میں متکلمین و فلاسفہ سے بڑھ کر مضطرب و محروم و اطمینانِ قلب و سرورِ روح کی لذت سے یکقلم نا آشنا اور کوئی گروہ نہیں" پھر مشاہیر فلاسفۂ قدما، و اربابِ مقالات کے چند اقوال سنائے جن میں انھوں نے خود اپنے وجود پر مجہولیت و نامرادی اور بدحالی و بے بصیرتی کی شہادت دی ہے۔ اسی سلسلے میں امام رازی کے اشعار پڑھے کہ اُن کی مدت العمر کی کاوش و تعمق اور طلب و جستجو کا ماحصل یہ تھا:

لعمری لقد طفت المعاهد کلها — وسیرت طرفی بین تلک المعا

فلم أر إلا واضعاً کف حائر — علی ذقن، او قارعاً سن ناد

---

(۱) قسم سے کہتا ہوں کہ تمام مقامات کا میں نے طواف کیا اور علم کی تمام جگہوں میں میری نظر نے چکر لگایا۔
(۲) مگر ہر جگہ میں نے دو ہی قسم کے لوگ دیکھے ... [illegible]

نے "اتحاد" کے مقام سے تعبیر کیا۔ یعنی اتباع اور تعشق و تشبہ بالانبیاء کے کمال تفانی و استہلاک سے بحکم "المرء مع من احبہ"

عن المرء لا تسئل وسل عن قرینہ[1]

مطیع و محب کا مطاع و محبوب کے تمام صفات و خصائص سے متمثل و متخلق ہو جانا اور بحکم "من کان اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما[2]" اور "حتی یکون ھواہ تابعاً لما جئت بہ[3]" اس درجہ اعتقاداً و عملاً استغراق محبت رسول و ترک ماسواہ کر بحکم "ومن یطع اللہ و رسولہ فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم[4]" کامل مرتبۂ معیت و یگانگت سے بہرہ اندوز و فائز المرام ہونا، اور

فاذا ابصرتہ ابصرتنی

کے معاملہ کا پیش آجانا۔ نہ وہ "اتحاد" جو ملاحدۂ حلولیہ کا اتحاد ہے، اور جو فی الحقیقت انسان کے تمام مخترعہ اقسام شرک میں سے اکبر و اغلظ قسم شرک کی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔ کیونکہ فی الاصل "اتحاد" مصطلح اصحاب حق و توحید کے معنی اس سے زیادہ نہیں کہ تخلقوا باخلاق اللہ[5]

رشتہ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست!

---

(۱) اگر کسی کی حالت جاننی ہے تو خود اس کی نہیں اس کے ہم نشینوں کی حالت کی جستجو کرو۔

(۲) جسے اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ پیارا ہو۔

(۳) یہاں تک کہ اس کی خواہش میری شریعت کے تابع ہو جائے۔

(۴) [illegible]

"قال شیخنا الفقد وہ عماد الدین الحزامی" یہی حافظ عماد الدین ایک رسالہ میں جو اصحاب و تلامذۂ ابن تیمیہ کے نام لکھا تھا، لکھتے ہیں "واللہ ثم واللہ، لم یر تحت ادیم السماء مثل شیخکم ابن تیمیۃ علماً و عملاً، وحالاً و خلقاً و اتباعاً، و کرماً و حلماً، و قیاماً فی حق اللہ تعالیٰ عند انتہاک حرماتہ" قریب قریب یہی الفاظ ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک موقعہ پر لکھتے ہیں "و واللہ ما رأینا فی عصرنا ھذا من تستجلی النبوۃ المحمدیۃ وسننہا من اقوالہ و افعالہ الا ھذا الرجل یشہد القلب الصحیح ان ھذا ھو الاتباع حقیقۃ!" یعنی قسم خدا کی، آسمان کے نیچے آج تمہارے شیخ ابن تیمیہ کا نظیر و مثیل کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ نہ علم میں نہ عمل میں، نہ حال میں نہ اخلاق میں، نہ اتباع حق اور نہ شیوۂ کرم و کمال حلم میں، اور نہ اللہ اور اس کے شعائر کے حفظ و قیام کی راہ میں، اور قسم خدا کی، ہم نے اپنے زمانے میں کسی کو نہ دیکھا جس کے اقوال و افعال سے نبوت محمدی کے انوار اور اُن کی سنت کی روشنیاں چھن چھن کر نکلتی ہوں۔ الا ابن تیمیہ کو اُن کو دیکھکر دل بے اختیار بول اٹھتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی اتباع اسے کہتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے! ۔ انتہیٰ۔ یہ حافظ موصوف کی شہادت ہے۔ میں کہتا ہوں اُسوۂ محمدی کے کامل تاسی اور علوم و معارف نبوت کے کامل استفاضہ کا یہی وہ مقام ہے جسکو اصحاب اشارات نے "نسبت محمدی" سے تعبیر کیا ہے، تو یہ "نسبت محمدی" ہے۔ اور "فیض محمدی" کا وہ استفاضۂ تامہ جس کی نسبت صاحبِ فتوحات نے کہا کہ امت مرحومہ کے لئے قطبیت و فاتحیت اور ولایت کبریٰ کا منتہیٰ مرتبہ ہے۔ اور پھر یہی وہ حقیقت ہے، جسکو بعض اصحاب اصلاح

تو "سنت محفوظ" کا علم و عمل ہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جو اعمال نبوت کا دروازہ کھولدیتی ہے۔
حافظ برزالی کا قول شاید اوپر گذر چکا ہے "ما رأینا احداً اعلم بکتاب الله وسنة رسوله
ولا اتبع لهما منه" ہم نے ابن تیمیہ سے بڑھکر نہ تو کسی کو کتاب و سنت کا عالم دیکھا اور
نہ عامل۔ سبحان اللہ کیسے جامع ومانع لفظوں میں تعریف کی ہے کہ اس آدھی سطر کے اندر سب کچھ
آگیا جو ابن تیمیہ کی نسبت کہا جا سکتا تھا۔ ایسے ممدوح کے لئے ایسے ہی مداحوں کے قلم و زبان
کی ضرورت تھی۔ پس یہ چیز کہ کمال علم کتاب و سنت کے ساتھ کمال عمل کتاب و سنت بھی
جمع ہو جائے، وہ فضل مخصوص ہے جس کے بغیر نبوت کا پورا پورا علمی عملی ورثہ نہیں مل سکتا
گو بقدر استعداد و استحقاق ہر سالک طریق کے حصے میں کچھ نہ کچھ ضرور آتا ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا!

اور یہ جو کہا تو صرف جوشِ عقیدت کی مداحی نہیں ہے، بلکہ اُن کے معاصرین میں جو لوگ صاحب نظر
ونقد تھے، خود اُن کی زبانوں سے بعینہ یہی حقیقت نکل چکی ہے۔ حافظ ابو العباس عماد الدین
واسطی الحزامی صاحب "البلغہ فی الفقہ" باعتبار علم کے شیخ العصر اور باعتبار عمل و زہد و ورع
کے بڑے بڑے اہل اللہ اور اصحاب طریقت کے ممدوح و مقصود تھے۔ حافظ ذہبی نے اُن کو
اپنے شیوخ کتب(۱) میں سے شمار کیا ہے۔ کتاب المشتبہ میں اُن کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں

بقیہ نوٹ صفحہ ۶۲۔ سے انکار کرتا ہے وہ یا تو مجنون ہے یا کمال سفیہ و بلید یا سخت شریر و مفسد۔ حافظ عسقلانی
کی رائے اس تقریظ پر موقوف نہیں۔ ان کی شیفتگی و ارادت کا جو حال ہے وہ درر کامنہ سے ظاہر ہوتا ہے جس میں بہت
... ...ین کی شہادتیں ان کے فضل و کمال مخصوص پر جمع کی ہیں۔
... ... نوٹ ... ہے "تذکرہ" میں دیکھنا چاہیے۔

236122

استنباط میں اُن کا رسوخ و احاطہ عجیب و غریب ہے۔ یہانتک کہ اُن پر یہ بات صادق آتی ہے کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں! اور معجم شیوخ میں لکھتے ہیں "نحل السنة المحفوظة حتی اعلی اللہ تعالےٰ منارہ وجمع قلوب اهل التقوی علی محبتہ"

بقیہ صفحہ ۶۴۔ تذکرہ کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ اُن کے ابتلا و محن اور وقعات مصریہ و شامیہ کے حالات لکھے ہیں۔ امام موصوف کی ایک مشہور کتاب منہاج السنت ہے۔ اُس کو اُنہوں نے مختصر کیا تھا اُس کے دیباچہ میں بھی مفصل ترجمہ درج کیا ہے۔ علاوہ بریں ابن تیمیہ کی اکثر مصنفات اپنے قلم سے لکھی ہیں اُن کے آخر میں یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ "میں نے خود مصنف سے بہ شرائط قرات و سماعت اجازت لی" مختصراً تذکرہ حالات و مناقب بھی کرجاتے ہیں۔ من احب شیئًا اکثر ذکرہ۔ قول مندرجہ متن معجم کبیر میں ہے۔ حافظ ابن ناصر الدین شافعی نے الرد الوافر میں اور حافظ عسقلانی و سیوطی نے درر کامنہ اور طبقات الحفاظ میں یہ تمام اقوال یکجا کر دیئے ہیں۔ نیز حافظ ابن قدامہ و حافظ عماد الدین اسطی اور ابوحفص بزاز وغیرہم نے سیرت ابن تیمیہ میں۔ اور واضح ہے کہ صرف حافظ ذہبی ہی کا یہ حال نہیں ہے۔ الرد الوافر میں تقریبًا ایک سو اکابر و مشاہیر عہد و قریب العہد کے اقوال نقل کئے ہیں جنہوں نے بالاتفاق اُن کے مجتہد مطلق، امام العصر، نادرۃ الدہر، نابغۃ الاسلام، اوحد الزمان، مجدد کتاب و سنت، محی الملت، انموذج الخلفاء الراشدین، اخر الائمۃ المجتہدین، مفتی الفرق، الامام فی کل علم وفن، اعجوبۃ علماء القرون الوسطیٰ ہونے کا ایسے لفظوں میں اعتراف کیا ہے جن سے زیادہ توصیف و تمجید کے الفاظ نہیں ہوسکتے:

نہ من براں گل عارض غزل سرایم و بس　　　　کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار آمند!

یہ حال تو معاصرین اور قریب العہد علماء کا ہے۔ بعد کے مورخین کا یہ حال ہے کہ الرد الوافر پر مصر و شام کے مشاہیر علماء و ائمہ عصر نے تقریظیں لکھیں ہیں۔ اُن میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور قاضی عینی حنفی شارح بخاری بھی ہیں۔ قاضی عینی لکھتے ہیں، جو شخص ابن تیمیہ کے مراتب عالیہ علم و عمل و اجتہاد و امامت

(باقی نوٹ صفحہ ۶۶ پر دیکھو)

اور اخلاق وصفات نبویہ کے کامل تاسّی اور سنت سنیۂ خالصہ و محضہ کے کمال اتباع و تفانی سے وراثت و نیابتِ انبیاء و رسل کے مرتبہ پر پہونچ جاتے ہیں، اور معالجۂ النفوس و تداوی ارواح و قلوب و طبابت اقوام و ملل کے تمام اسرار و خفایا۔ اُن پر اس طرح کھل جاتے ہیں کہ بقول صاحبِ تفہیمات "گویا ہمہ را میان ہر دو چشم خود متمثل و متشبح می بینند" و نہ از چشم بصیرت بلکہ از چشم سر مشاہدہ می کنند" کا مقام کشف و رفع حُجب حاصل ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے غنیۃ الطالبین میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے "ہم حراس القلوب، جواسیس الارواح، الامناء علی السرائر والخفیات، المطلعون علی ما اضمرت بواطن العباد و انطوت علیہ النیات" وہ دلوں کے نگراں و نگہبان، روحوں کی جاسوسی کرنے والے، رازوں اور بھیدوں کے خزانچی، اور سینوں کے اندر کی چھپی ہوئی باتوں، اور دلوں کی تہ کی نیتوں کی خبر رکھنے والے لوگ ہیں! تو اگر چہ اُس عہد میں بڑے بڑے اصحاب علم و عمل موجود تھے، مگر "علیم بادوا النفوس" اور "الطبیب المجرب" ہونے میں اُن کا کوئی حصہ نہ تھا، اور کچھ تھا تو مرتبۂ قوت نظری سے قوت عملی تک نہیں پہنچا تھا۔ و ذلک من عمل النبوۃ - یہ بات صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے حصے میں آئی تھی، اور ہر عہد میں صرف ورثاء و نقباء نبوت و اصحاب عزائم و تجدید ہی کے حصہ میں آتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کی طرف حافظ ذہبی نے اُن کے حالات میں اشارہ کیا کہ "ولقد نصر السنۃ المحضۃ والطریقۃ السلفیۃ، واحتج لہا ببراھین و مقدمات و امور لم یسبق الیہا و اطلق عبارات احجم عنہا الاولون والاخرون"، یعنی ابن تیمیہ نے سنت محضہ اور طریقت خالصہ سلف و اوائل کی حمایت کی، اور اُس کے لئے ایسی دلیلوں

وجاهد فی ذات الالٰہ بنفسه ویالمال والاهلین والام والاب[1]

و من رام حبرًا دونه الیوم فی الوریٰ فذاک الذی قد رام عنقاء مغربا[2]

علیم بادواء النفوس یسوسها بحکمته فعل الطبیب المجرب[3]

فری شعر محض شاعرانہ مداحی نہیں ہے۔ ایک نہایت ہی دقیق نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔
علیم بادواء النفوس" اور "بحکمته فعل الطبیب المجرب" یعنی مقام نبوت کی وراثت
نیابتِ کاملہ۔ یہ بات کہ جس طرح ایک طبیب حاذق ہر طرح کی بیماریوں اور اُن کے
سباب وآثار ونتائج کو جانتا، اور ہر عمر ومزاج کے بیماروں کا علاج کرتا، اور کمال حذاقت
راست طبیہ کی وجہ سے صرف چہرہ دیکھکر یا نبض پر انگلیاں رکھکر سب کچھ سمجھ لیتا اور
لہ لیتا ہے، اُسی طرح جماعت وملت کے تمام امراض جدیدہ ومزمنہ اور ظاہرہ ومخفیہ کا
احض ہونا، اور انسان کی ذہنی ونفسی اور روحانی ومعنوی بیماریوں کو بہ یک نظر تفرس پہچان لینا
ٹھیک ٹھیک اُس کی حالت واستعداد اور مقتضیات کے مطابق درجہ بدرجہ علاج کرنا
ہر مریض کو اُس کی حالت کے مطابق نسخہ دینا، اعمال مہمہ ومختصہ نبوت میں سے ہے، اور
وعلیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة[1] میں "یزکیهم" اُسی جانب اشارہ
ہا انبیاء کرام کے بعد یہ مقام صرف اُنہی نفوس خاصہ کو حاصل ہو سکتا ہے جو اُسوۂ حسنۂ نبوت

---

[1] اُس نے اپنی جان، مال، اہل وعیال، اور ماں باپ سب سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے۔
[2] آج اُسے چھوڑ کر مخلوق میں کسی اور حبر کو تلاش کرنا عنقاء مغرب کا تلاش کرنا ہے۔
[3] تمام نفسی بیماریوں کا ماہر ہے اور طبیب مجرب کی طرح اپنی حکمت سے قلوب کی قیادت کرتا ہے۔
[4] "اور" پاک کرے اور کتاب وحکمت سکھائے۔

تو وہ جو ایک چیز ہے کہ "آنے دارد" اُس کے لئے کسی کا صرف خوبصورت ہونا ہی کافی نہیں۔
خوبصورت تو ہزاروں ہوتے ہیں مگر "آن" رکھنے والے چشم و ابرو لاکھوں خوبانِ روزگار میں بھی ڈھونڈے
نہیں ملتے۔ اور اگر ملجائیں تو سمجھنا چاہیئے فطرت کی بڑی ہی فیاضی بلکہ غیر متوقع اسراف ہے
شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے عہد میں حسینوں اور خوبرویوں کی کمی نہ تھی۔ معاجم ذہبی اور درر کامنہ عسقلانی
سے اگر اُس عہد کے صرف ایسے علمار کبار کی ایک فہرست طیار کرلی جائے جو اپنے کمال علم وعمل کی بنا
پر ائمۂ عصر و اساطینِ علوم تسلیم کئے گئے تو ان کی تعداد سو سے بھی متجاوز ہوگی۔ صاحب الرد الوافر
نے صرف اُن علمار کا ذکر کیا ہے جنہوں نے شیخ الاسلام کے مرتبۂ اجتہادِ مطلق و امامت فی الدین
کا اعتراف کیا۔ اُن میں سے صرف معاصرین کو چھانٹ لیا جائے تو ساٹھ ستر سے کم نہ ہونگے
یہ سب یقیناً حسین تھے۔ اور بعض کی حسن و رعنائی پر تو ایک زمانہ فریفتہ و شیدا ہوا۔ اور
کتنے ہی حسینانِ روزگار نے ان سے دلربائی و دلاویزی کے بھید اور نکتے سیکھے۔ تاہم اِس کو کیا
کیجئے کہ وہ جو ایک چیز حسن و خوبروئی سے بھی بلند تر ہے' یعنی عزیمت دعوت و تشبہ بالانبیار کی
شان و آن' تو اُس کے لئے صرف حسن طلعت و بلندی قامت ہی کافی نہیں۔ ان باتوں کے
علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیئے۔ اور وہ اُس عہد میں صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے حصہ میں آیا تھا

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری ست کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری ست!

حافظ برزالی' ابو الحجاج مزی' ابن سید الناس' ابن دقیق العید' ذہبی' ابن نصر مقدسی' ابو
حیان صاحب تفسیر' ان خوبان عہد کے حسن و جمال پر کون نام دھر سکتا ہے؟ لیکن وہ سب
یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کا سا جمال ہماری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا اور اُن کا

کے عہد میں بھی ایسے لوگ تھے جن کی نظروں پر تعصب و نفسانیت یا جہل و تقلید کا حجاب پڑگیا تھا' پس ان کو وہی نظر آیا جو بند آنکھوں کو نظر آسکتا ہے:

"وما ضر نور الشمس ان کان ناظرًا الیہا عیون لم تزل دہرہا غمضا"[1]

لیکن یہاں ان کا ذکر نہیں۔ اصحاب بصارت جتنے تھے' ان سب نے بالاجماع یہی کہا "ما رأیت مثلہ ولا رای ہو مثل نفسہ" اور یہی وہ خصائص بینۂ و باہرۂ مقام تجدید نیابتِ نبوت کے ہیں جن کی نسبت بار بار کہہ رہا ہوں کہ بڑے سے بڑے سر کو بھی یہاں جھکے بغیر چارہ نہیں:

فانک شمس والملوک کواکب اذا طلعت لم یبد منہن کوکب[2]!

تم جانتے ہو ایک چیز خوبصورتی ہے' اور ایک چیز اُس سے بھی بڑھکر ہے جس کے لئے زبان کچھ بھی نہیں کہہ سکتی لیکن آنکھ سمجھتی اور ذوق پہچان لیتا ہے۔ خواجہ حافظ نے اس کو "آن" سے تعبیر کیا ہے:

شاہد آن نیست کہ موئے و میلنے دارد بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اور پھر جب بالکل مجبور ہو گئے تو اشارہ کر کے چھوڑ دیا:

ایں کہ می گویند "آن" بہتر ز حسن

یار ما "ایں" دارد و "آں" نیز ہم!

---

(۱) آفتاب کے نور کو اس سے کیا نقصان پہونچ سکتا ہے کہ اُسے دیکھنے والی ایسی آنکھیں ہیں جو سدا سے بند ہی ہیں

(۲) تو آفتاب ہے' اور بادشاہ ستارے ہیں' جب تو طلوع ہوتا ہے تو ان میں سے کوئی ستارہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

قمریاں پاس غلط کردۂ خودمی دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

یہاں ایک بات قابل غور ہے۔ "ما رایت مثلہ ولا رای ھو مثل نفسہ" یہ جملہ اُن کے اکثر معاصرین کی زبان پر بعینہ جاری ہوا ہے۔ ذہبی اور مزی کی زبانی سن چکے۔ حافظ برزالی اور ابن حجی سے ایسا ہی منقول ہے شیخ عماد الدین واسطی، ابن سید الناس، ابن نصر مقدسی، ابن دقیق العید وغیرہم نے بھی یہی کہا۔ الرد الوافر اور قول الجلی کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ تقریباً سبھوں نے بعینہ یہی جملہ دہرایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یا تو کسی عارف و جوہر شناس نے انکے وصف میں سب سے پہلے یہ جملہ کہا تھا لیکن کچھ ایسا صحیح و موزوں واقع ہوا کہ تمام باکمالان عہد کی زبانوں پر خود بخود چڑھ گیا:

جامۂ بود کہ بر قامت او دوختہ بود!

یا اُس نادرۃ الدہر کی بے ہمتائیوں کا یہ حال تھا کہ جو نظر پڑتی تھی بے ساختہ یہی کہہ اٹھتی تھی۔ سورج کو کروڑوں آنکھیں دیکھتی ہیں، لیکن ہر آنکھ کو یہی نظر آتا ہے کہ روشن ہے۔ یہ تو کوئی نہیں کہتا کہ روشن نہیں؟ پریوں کے وجود میں لوگوں کو اختلاف ہے لیکن خوبصورت انسانوں کے بارے میں سب کی رائیں متفق ہیں۔ ایک حسین چہرا جو دیکھے گا وہی کہے گا جو سب کی زبانوں سے نکل رہا ہے:

این نگاہیست کہ شائستۂ دیدارے ہست!

مشہودات و محسوسات میں ہمیشہ تمام اصحاب انظار و احساس یک حکم و یک زبان ہوتے ہیں یہاں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ الا یہ کہ کوئی اندھا یا فاتر الحس ہو۔ سو شیخ الاسلام ابن تیمیہ

تقی الدین اضحی بحر علم ۔۔۔ یجیب السائلین بلا قنوط[1]

احاط بکل علم فیہ نفع ۔۔۔ فقل ماشئت فی البحر المحیط[2]

حافظ ابو الحجاج مزی صاحب تہذیب جس مرتبہ کے امام الحدیث تھے اُس کا حال امام ذہبی کی مصنفات خصوصاً تذکرہ و معاجم اور طبقات کبریٰ سبکی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ اُن کے تمام معاصرین اس پر متفق ہیں کہ وہ نہ صرف جرح و تعدیل رجال کے امام تھے بلکہ اس فن کے اماموں کے امام۔ ہزاروں السانوں کی ثقاہت کا فیصلہ اُن کے قبضۂ علم میں تھا۔ بااین ہمہ یہ مقامات آور ہیں اور نسبتِ نبوت، و نیابتِ کاملہ منصبِ رسالت، و عزیمتِ دعوتِ کبریٰ کا مقام دوسرا ہے۔ وہ تو اُس عہد میں صرف ابن تیمیہ ہی کے لئے تھا۔ چنانچہ خود انہیں بھی وہی کہنا پڑا جو اُس عہد کے تمام اصحاب حق نے کہا تھا "ما رأیت مثلہ ولا رای ھو مثل نفسہ وما رأیت احدا اعلم بکتاب اللہ وسنۃ رسولہ ولا اتبع لھما منہ" نہ میں نے اُن کا مثل دیکھا نہ خود انہوں نے کسی کو اپنا ہمتا پایا۔ نہ میں نے کسی شخص کو اُن سے زیادہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والا اور کتاب و سنت کا اتباع کرنے والا دیکھا! حافظ موصوف نے ایک اور موقعہ پر کہا "لم یر مثلہ منذ اربع مائۃ سنۃ" چار سو برس سے ایسا باکمال پیدا نہیں ہوا!

بقیہ صفحہ ۵۹:- ان کے شاگرد علامہ تاج سبکی کا یہ قول کفایت کرتا ہے "وھو رجل الرجال فی کل سبیل کانما جمعت الامۃ فی صعید واحد فنظرھا!" قال فی طبقاتہ الکبریٰ۔

(۱) تقی الدین علم کا بحر ذخار ہے سائلوں کو بغیر مایوس کئے جواب دیتا ہے۔

(۲) اُس نے تمام مفید علوم کا احاطہ کر لیا ہے اب بحر اعظم کی وسعت کے بارے میں جتنا چاہو کہو۔

کا جو ایک مقام خاص ہے، وہ ان میں سے کسی کے حصے میں بھی نہ آیا۔ وہ صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے لئے تھا، سب اپنے دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے، لیکن انہوں نے وہ سب کام بھی اُن سے بہتر کئے جو وہ سب کر رہے تھے، اور پھر اُن سے بڑھکر یہ کہ سب کو راہ عزیمت و دعوت و تجدید و احیاء ملت میں منزلوں پیچھے چھوڑ دیا، اور علوم و اعمال وہبیہ و سماویہ کی اُن بلندیوں پر تن تنہا جا کھڑے ہوئے جہاں اُن کے اقران و معاصرین کو یک زبان و یک قلم ہو کر اعتراف کرنا پڑا "ما رأینا مثلہ وانہ ما رای مثل نفسہ" نہ تو ہماری آنکھوں نے اس کا مثل دیکھا اور نہ خود اُسے کوئی اپنا سا نظر آیا:

اے تو مجموعۂ خوبی، بچہ نامت خوانم؟

حافظ ذہبی اپنے معجم شیوخ میں جب اس نادرۃ الاعصار و اعجوبۃ الدہر کے اوصاف و مدائح لکھتے لکھتے تھک گئے اور وہ ختم نہ ہوئے، تو بالآخر یہ کہکر خاموش ہو جانا پڑا "وھو اکبر من ان ینبہ علی سیرتہ مثلی۔ وواللہ لو حلفت بین الرکن والمقام انی ما رأیت بعینی مثلہ وانہ ما رای مثل نفسہ، لما حنثت!" اُن کا مقام کہیں اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ مجھ جیسا شخص اُن کی سیرت و فضیلت بیان کرے۔ قسم خدا کی، اگر میں خانہ کعبہ میں عین رکن و مقام کے درمیان کھڑے ہو کر قسم کھاؤں کہ نہ تو میری آنکھوں نے اُن کا مثل دیکھا نہ خود انہوں نے اپنا ہمتا، تو میری قسم سچی ہوگی اور میرے لئے کفارہ نہیں"! وکفاک بالذہبی شاہدا! (۱)

---

(۱) یہ امام ذہبی کا قول ہے، اور خود امام موصوف کے تبحر و جامعیت علم کا جو حال تھا، اُس کا...

باقی صفحہ ۵۶

مشکلات و معضلاتِ کار کو صاف کر کے اور ضبط و اتقان و تہذیب و ترتیب و تلخیص و تشریح و نقدِ رجال و اسناد سے آراستہ و پیراستہ کر کے تمام آنے والی امت کے لئے اتباعِ سنت کی راہ بالکل سہل و آسان کر دی علومِ اسلامیہ پر پہلا دورِ تدوین کا گذرا ہے، دوسرا انضباط و تنقیح اور تہذیب و تنظیم کا، سو علمِ حدیث کے دورِ دوم میں ان دو بزرگوں کی خدمات سب سے فائق اور سب سے انفع واقع ہوئی ہیں۔ یہ انہی کی خدماتِ حسنہ کا نتیجہ ہے کہ آج یہ علمِ مقدس اس قدر صاف و سہل ہو گیا ہے کہ طالبینِ عمل بالسنت کے لئے کسی طرح کی عذر داری و بہانہ جوئی کی گنجایش باقی نہ رہی۔ امت کا کوئی فرد اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ حدیث پر عمل کرنا بمقابلہ کتب جدل و خلاف و کذا عند زید و کذا عند فلاں کے زیادہ مشکل ہے۔ بلکہ جس طالب صادق کا جی چاہے آنکھیں بند کرے اور اس صراطِ مستقیم پر بے غل و غش و بے خوف و خطر دوڑتا چلا جائے۔ فھو طریقًا مستقیمًا، سہلًا، مسلوکًا، واسعًا، موصلًا الی المقصود و المطلوب اور رضی اللہ عن الذہبی حیث یقول:

الفقہ قال اللہ قال رسولہ ۔۔۔ ان صح والاجماع فاجھد فیہ[1]

وحذار من نصب الخلاف جھالۃ ۔۔۔ بین النبی و بین رأی فقیہ[2]

پس غور کرو کہ ایسے اصحابِ کمال و ائمۂ علم تھے جو اس عہد میں موجود تھے با ایں ہمہ حقیقت سورج کی طرح چمک رہی ہے اور ہر صاحبِ بصارت پر روشن کہ تمام عزیمت و دعوت

---

(۱) فقہ اللہ کا قول اور رسول کا قول ہے اگر ثابت ہو جائے اور اجماعِ امت ہے پس اسی میں کاوش کر۔

(۲) خبردار! جہالت کی راہ سے نبی کے ساتھ فقیہ کے قول کو مخالف نہ ٹھیرا۔

پھر یہ بھی نہیں کہ صرف ایسے ہی لوگ ہوں جن کا شمار عامۂ علماء و مشایخ میں کیا جائے، بلکہ بڑی بڑی حفاظ و نقاد علوم اور خواص و اعاظم نظر و اجتہاد موجود تھے جن کے بعد اُس درجہ کے لوگ تمام عالم اسلامی میں پیدا نہیں ہوئے۔ ابو الفتح ابن سید الناس اشبیلی، شمس الدین مقدسی، ابو العلا انصاری السبکی، قاضی ابن الزملکانی، سید ابو المحاسن دمشقی، ابو عبد اللہ حریری، ابو العباس ابن عمر الواسطی، حافظ ابو الفدا عماد الدین، حافظ احمد بن قدامہ مقدسی، ابو اسحاق السعدی، امام برہان الدین الفزاری، حافظ صلاح الدین بعلبکی، شیخ صفی الدین بغدادی، حافظ ابن شامہ دمشقی، قاضی تقی الدین دقوقی، شیخ عمر بن الوردی، امام ابو العباس بن یحییٰ حافظ جمال الدین عقیلی، حافظ برزالی الاشبیلی، تقی الدین السبکی، حافظ جمال الدین المزی، امام تقی الدین ابن دقیق العید، ابو حیان صاحب تفسیر، حافظ ابو عبد اللہ الذہبی اور ان کے علاوہ بے شمار ائمہ و اعلامِ عہد جن کے حالات حافظ ذہبی اور ابن قدامہ عسقلانی کی مصنفات میں موجود ہیں۔ تو تم ان لوگوں کی نسبت کیا سمجھتے ہو؟ کون ہے جو ان بزرگوں کے فضل و کمال اور ورع و تقویٰ اور اتباع حق و سداد سے انکار کرسکتا ہے؟ علی الخصوص حافظ مزی، برزالی، ابن دقیق العید، اور حافظ ذہبی تو اس پایہ کے بزرگ تھے کہ ان میں سے ہر شخص علوم سنت کا خزانہ اور حفظ و نقد کا امیر المومنین تھا۔ علمائے حدیث متاخرین میں سے کسی مصنف کا بھی ہم اخلاف امت و بیچارگان دورۂ آخر پر اس درجہ احسان نہیں ہے جس قدر حافظ ذہبی کا۔ اور اگر کوئی دوسرا اس وصف میں اُن کا شریک ہے تو وہ صرف اُن سے متاخر حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ پس لہا ثالث ہی وہ دو حافظ و ناقد علوم حدیث ہیں جنہوں نے نہ صرف سلف کے ذخائر و خزائن خلف کے لئے محفوظ کر دیئے، بلکہ تمام

فصل

یہ تو اوائل کا حال تھا عہد متاخرین میں بھی دیکھو تو ظہور عزیمت دعوت و تجدید امت کی بوا لعجبیوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا۔ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں جب دعوت عامہ امت و تجدید شریعت، و احیاء السنت بعد موتہا، و اماتہ البدعتہ بعد شیوعہا وارتفاعہا کی روح اللہ نے شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وجود مبارک میں ظہور کیا، اور عہد اواخر کے تمام مسالک دعوت و تجدید کی ریاست و فاتحیت کا مقام اس مجدد اعظم کے سپرد کیا گیا، تو کیا اُس زمانہ میں بجز شیخ الاسلام ممدوح کے اور کوئی عالم حق نہ تھا؟ تاریخ اسلام میں اُس عہد کی جس قدر تفصیلات ملتی ہیں، کسی عہد کی نہیں ملتیں۔ اگرچہ عربی خلافت کے کلی اختتام اور فتنہ عظیمہ یاجوج ماجوج (تاتار) کے من کل حدب ینسلون، اور تفرق مذاہب و تشتت جماعت، و شیوع بدع، و احاطۂ تقلید، و سد باب نظر و اجتہاد کے مفاسد و مصائب اس زمانے میں پوری طرح ظہور کر چکے تھے، اور مسلمانوں کے علمی و عملی تنزل کا بیج اچھی طرح بارآور ہو چکا تھا، با ایں ہمہ ائمۂ دین اور کاملین علوم کی ایک جماعت کثیرہ ہر حصۂ ملک میں موجود تھی، اور علی الخصوص دیار مصر و شام تو علماء و کاملین امت سے مملو و مشحون تھے۔ حتیٰ کہ قاضی ابوالبرکات مخزومی اپنے بائیہ میں صرف دیار شام کی نسبت کہتے ہیں:

وکان فی عصرہ بالشام یومئذ   سبعون مجتہداً من کل منتخب[1]

---

(۱) ان کے زمانہ میں منتخب ستر مجتہد موجود تھے۔

یہ معاملہ تو گذشتہ معاملہ سے بھی کہیں زیادہ میرے لئے سخت ہے وہ دین کے بارے میں فتنہ تھا اور یہ فتنہ، دنیا ہے (یعنی مصائب و محن کی آزمایش کہیں زیادہ پرامن ہے، بمقابلہ آزمایش نعیم دنیا و دعوت طمع و ترغیب کے، اور یہ بالکل حق ہے۔ کتنے ہی شہسواران ثبات و استقامت ہیں جو پہلے میدان آزمائش سے تو صحیح و سلامت نکل گئے، مگر دوسری راہ سامنے آئی تو اول قدم ہی میں ٹھوکر لگی۔ حالانکہ مرد کامل وہ ہے جس پر یدعون ربہم خوفاً و طمعاً(۱) کا مقام ایسا طاری ہوجائے کہ دنیا کا خوف اور دنیا کی طمع، دونوں قسم کے حربے اُس کے لئے بالکل بیکار ہو جائیں ہم القوم الذین لا یشقی جلیسھم ولا یستوحش انیسھم، قد نالوا مطالبھم برفع اکفھم الی خالقھم، لا یحتاجون فی حوائجھم الا الیہ، ولا یعولون فی مقاصدھم الا علیہ!(۲) للہ در ما قال:

ونبئت لیلی ارسلت بشفاعۃ ۔ الی، فھلا نفس لیلی شفیعھا(۳)
أأکرم من لیلی علی، فتبتغی ۔ بہ الوصل، ام کنت امرءً لا اطیعھا(۴)

---

۱) اپنے رب کو امید و بیم سے پکارتے ہیں

۲) یہی وہ لوگ ہیں جن کا ہم صحبت بدبختی میں نہیں پڑتا، ان کا ہم مجلس اکتاتا نہیں، انھوں نے اپنی مرادیں اپنے خالق کی طرف ہاتھ اٹھا کر پالیں، وہ اپنی ضرورتوں میں اُس کے سوا کسی کے محتاج نہیں ہوتے اور نہ اپنے مقاصد میں بجز اس کے کسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

۳) مجھے خبر ملی ہے کہ لیلی نے میرے پاس سفارش بھیجی ہے، مگر کیا خود لیلی اپنی سفارش نہیں ہے؟

۴) کیا کوئی میری نظر میں لیلی سے بھی بڑھکر ہے کہ جس کے ذریعہ وصل کی آس لگائی جائے یا میں ایک ایسا شخص ہوں جو لیلی کا تابعدار نہیں؟

مظالم کی تلافی ہو جائے ایک بار اُس نے بیس ہزار سکے بھیجے اور دربار میں بلایا۔ ایک بار ایک لاکھ درہم بھیجا اور سخت اصرار کیا کہ قبول کر لیجیے۔ لیکن ہر مرتبہ امام موصوف نے انکار کر دیا اور کہا میں اپنے مکان میں اپنے ہاتھ سے اس قدر کشتکاری کر لیتا ہوں جو میری ضروریات کیلئے کافی ہے (۱) یہ بوجھ اٹھا کر کیا کروں گا۔ کہا گیا کہ اپنے لڑکے کو حکم دیجئے وہ قبول کر لیں فرمایا وہ اپنی مرضی کا مختار ہے۔ لیکن جب عبداللہ سے کہا گیا تو انہوں نے بھی واپس کر دیا۔ آخر مجبور ہو کر لانے والوں نے کہا خود نہیں رکھنا چاہتے تو فقراء و مساکین کو بانٹ دیجئے فرمایا میرے دروازے سے زیادہ امیر المومنین کے محل کے نیچے فقیروں کا مجمع رہتا ہے۔ فقیروں ہی کو دینا ہو تو وہیں دیا جائے۔ اس ہنگامہ کی یہاں کیا ضرورت ہے؟ ایک مرتبہ اسحاق بن ابراہیم کے سخت اصرار سے دس ہزار درہم لے لئے تو اُسی وقت مہاجرین و انصار کی اولاد میں تقسیم کر دئے

عذیل ہمت ساقی ست فطرت عرفی

کہ حاتم دگران و گدائے خویشتن ست!

اُن کے لڑکے راوی ہیں کہ جب خلیفہ متوکل اُن کی تعظیم و تکریم میں حد درجہ غلو کرنے لگا تو انہوں نے کہا "ھٰذا امر اشد علی من ذٰلک۔ ذاک فتنۃ الدین و ھٰذا فتنۃ الدنیا"

---

(۱) حافظ ابن جوزی اور خطیب نے لکھا ہے کہ امام موصوف کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ اپنے مکان کی زمین میں تھوڑی سی کشتکاری کر لیتے اور اسی پر قانع رہتے۔ زراعت کی زکوٰۃ سال بسال ادا کرتے اور اس بارے میں اُن کا عمل حضرت عمر کے فرمان خلافت پر تھا جو انہوں نے ارض سواد عراق کی نسبت [illegible] عاد کل جریب [illegible] درہما و قفیزا" غور کرو یہ حال علماء سلف کا تھا اور یہ حال آج [illegible] یاکلون اموال الناس بالباطل الخ

أضحى ابن حنبل محنة مامونة　　وبحب احمد يعرف المتنسك[1]

فاذا رأيت لاحمد متنقصا　　فاعلم بان ستوره ستهتك[2]

امام موصوف کا یہی وہ مقام ہے جس کی طرف بشر حافی نے اشارہ کیا تھا "قام احمد مقام الانبیاء"[3] اور کہا کہ امام احمد کی استقامت وثبات کی آزمائش لگاتار چار بادشاہوں نے کی "بعضهم بالضراء وبعضهم بالسراء"[4] مامون، معتصم اور واثق نے ضرب وحبس سے آزمائش کی، متوکل نے تعظیم وتکریم اور عطا وبخشش سے لیکن "فكان فيها معتصما بالله عز وجل"[5] ان کی استقامت وعشق حق پر نہ تو خوف دنیا غالب آیا نہ طمع دنیا غالب آئی، دونوں کسوٹیوں پر یہ سونا یکساں طور پر کھرا نکلا! و البلاء للولاء کا للنار للذهب:

بندگان تو کہ در عشق خداوندانند

دو جہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند!

مامون و معتصم اور الواثق نے جو کچھ کیا وہ معلوم ہے۔ جعفر المتوکل کا یہ حال ہے کہ اس کی خلافت بدعت وارباب بدعت کے زوال وخسران اور سنت واصحاب حدیث کے امن وعروج کا اعلان عام تھی۔ حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں متوکل باللہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا کہ کسی طرح پچھلے

---

(۱) ابن حنبل ایک مبارک آزمائش ہو گئے، احمد کی محبت سے عابد پہچانا جاتا ہے۔

(۲) جب احمد کی برائی کرتے کسی کو دیکھو، تو سمجھ لو کہ اس کے عیب عنقریب کھلیں گے۔

(۳) احمد نے انبیاء کی قائم مقامی کی۔

(۴) ان میں سے بعض نے مصیبت میں ڈال کر اور بعض نے عیش بیش کر کے۔

(۵) لیکن وہ ان سب میں خدا کی رسی تھامے رہے۔

استوی[1] اور یدو علو ونزول کے دقیق وفلسفیانہ معانی بھی انہیں معلوم نہ تھے برخلاف اس کے عصابۂ صالحہ کتاب وسنت وطائفۂ حقۂ "ما انا علیہ واصحابی"[2] کہ جمیع طرق ومذاہب مبتدعہ سے یکسو ودامن کشاں ہیں اگرچہ "ان تعض باصل شجرۃ"[3] کی نوبت آجائے اور مبتدعین وارباب ہوا کے تمام شیوہ ہائے تیرہ وروش ہائے نا فرجام سے بکلی پناہ ڈھونڈھتے ہیں اگرچہ اس کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے نزدیک مبغوض ومردود ہو جائیں تو ان کا حال یہ ہے کہ اس امام اہل سنت کی محبت وپیروی کو اپنے ایمان کی زینت اور اپنے عقائد کی خوبروئی سمجھتے ہیں اور اُن کے مسلک سنت وحکمت[4] اور طریق محمدیت خالص بے مزج بدعت قیاس ورائے کے عشق وشغف سے اپنے قلب وروح کو ہمیشہ معمور وآباد رکھتے ہیں۔ ورحمۃ اللہ علی القائل وھو ابن اعین (کما نقل الخطیب فی التاریخ) اذ یقول:

---

(۱) رحمن عرش پر متمکن ہو گیا۔

(۲) جس طریقہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

(۳) یہ وصیت کی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ اعلم الصحابہ بالفتن کو کہ فاعتزل تلک الفرق کلہا ولو ان تعض باصل شجرۃ حتی یدرکک الموت یعنی جب مسلمانوں کی ایک جماعت اور ایک سبیل نہ رہے اور بہت سے فرقے ہوں، ہر طرف فرقوں میں بٹ جائیں تو طالب حق کو چاہئے کہ ان سارے بنائے ہوئے مذہبوں سے علیحدہ ہو کر الگ ہو جائے اور صرف مسلم ہو کر رہے۔ اگرچہ ایسا کرنے میں غربت وبیکسی کی وجہ سے درختوں کی جڑیں کھا کر گزارا کرنا پڑے تو اس کو بھی گوارا کرے مگر الگ مذہب بنانے والوں کا ساتھ نہ دے۔ پوری تحریر صحیح میں ہے

[illegible] ان لا تمر علی حال بادابھا

[illegible]

[illegible]

رکھتا ہے تو بس جان لو کہ صاحب سنت ہے۔ خطیب نے تاریخ میں ہمدانی کا قول نقل کیا ہے
"یعرف بہ المسلم من الزندیق" یہی کسوٹی پر مسلم کو زندیق سے پرکھا جائے گا۔ وورقی نے کہا
"من سمعتموہ یذکر احمد بن حنبل بسوء فاتھموہ علی الاسلام"[1]

انا من اھوی و من اھوی انا ۔۔۔ نحن روحان حللنا بدنا[2]

فاذا ابصرتنی ابصرتہ ۔۔۔ و اذا ابصرتہ ابصرتنا[3]

و یقرب من ھذا ما قیل بالفارسیۃ،

جذبۂ وصل بحدیست میان من و تو

کہ رقیب آمد و پرسید نشان من و تو

امام موصوف کے متعلق اسی حقیقت کو مزاحم الخاقانی نے ایک قطعہ میں نظم کیا تھا:

لقد صار فی الآفاق احمد محنۃ ۔۔۔ و امر الورٰی فیھا فلیس بمشکل

تری ذا الھوی جھلا لاحمد مبغضا ۔۔۔ و تعرف ذا التقوی یحب ابن حنبل

اور یہ بالکل حق ہے۔ آج بھی دیکھ لو۔ ارباب بدعت کو کبھی امام موصوف کا مسلک خوش نہ آئیگا
اُن کی محبت سے ان کا دل کورا ہو گا۔ بلکہ کہیں گے کہ اُن کا طریقہ تو تاویل و رائے کی عقلمندی سے
خالی اور محض ظاہر پرستی اور بے دانشی و بے علمی کا مجموعہ ہے۔ حتیٰ کہ الرحمن علی العرش

---

(۱) جسے احمد بن حنبل کی شکایت کرتے سنو اس کے اسلام میں شک کرو۔

(۲) میں وہی ہوں جس کی مجھے طلب ہے اور وہ جسے میں، ہم دو روحیں ہیں جو ایک ہی بدن میں سما گئی ہیں۔

(۳) جب تم نے مجھے دیکھ لیا تو اسے دیکھ لیا اور جب اُسے دیکھا تو مجھے دیکھ لیا۔

وابالیس کا وہ مکر و خدع بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا کہ لتزول منہ الجبال تو ظاہر ہے کہ چمڑے کے کوڑے اور لوہے کی دھار اُن کی استقامت پر کب غالب آنے والی ہے؟ یہ تو اس کے مقابلہ میں محض ایک ابتدائی اور آزمائشی منزل ہے:

کریں گے کوہکن کے جذب دل کا امتحاں آخر
ابھی اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمایش ہے!

فی الحقیقت حضرت امام موصوف کی نسبت محمدی اور کمال مرتبۂ تاسی باسوۂ نبوت کی یہی شان وجلالت ہے جس نے اُن کو تمام ائمہ ومجددین امت کی صفوف مراتب وکمال سے بلند کر کے ایک دوسرے ہی مقام پر پہنچا دیا ہے حتی کہ تمام ائمۂ اسلام میں یہ فضل مخصوص صرف انہی کے حصے میں آیا کہ ان کی محبت وپیروی اہل حق وسنت ہونے کی دلیل ٹھہری اور اُن سے انحراف بدعتی ہونے کی سب سے بڑی پہچان! اللہ تعالیٰ نے اُن کو فنا فی السنت ہونے کا وہ مرتبہ عطا فرمایا کہ کمال استغراق وتفانی کی وجہ سے خود اُن کی ذات گرامی ہی یکسر سنت واتباع سنت کا پیکر ومجسمہ بن گئی۔ بحدیکہ:

نتواں ترا د جاں را بہم امتیاز کردن!

جو اس امام کے قدم بقدم چلا اُس نے سنت کو پایا اور جس نے اُس کی راہ چھوڑی اُس نے سنت رسول ومنہج اصحاب رسول سے انحراف کیا۔ یہ کیا تھا کہ بڑے بڑے ائمہ عصر کو اعتراف کرنا پڑا "اذا رایت الرجل یحب احمد بن حنبل، فاعلم انہ صاحب سنۃ!" اگر کسی کو دیکھو کہ امام احمد سے محبت

ولقد احسن القائل:

لو یسمعون کما سمعت کلامها   خروا لعزۃ سجداً ورکوعا [1]

امام موصوف کے لڑکے عبد اللہ کہتے ہیں میرے والد ہمیشہ کہا کرتے "رحم اللہ ابا الھیثم غفر اللہ لابی الھیثم" خدا ابوالہیثم پر رحم کرے خدا ابوالہیثم کو بخش دے! میں نے ایک دن پوچھا ابوالہیثم کون ہے؟ کہا جس دن مجھے سپاہی دربار میں لے گئے اور کوڑے مارے گئے تو جب ہم راہ سے گذر رہے تھے ایک آدمی مجھ سے ملا اور کہا پہچانتے ہو؟ میں مشہور چور اور عیار ابوالہیثم حدّاد ہوں میرا نام شاہی دفتر میں ثبت ہے۔ بارہا چوری کرتے پکڑا گیا اور بڑی بڑی سزائیں جھیلیں۔ صرف کوڑوں ہی کی مار اگر گنوں تو سب ملا کر اٹھارہ ہزار ضربیں تو میری پیٹھ پر ضرور پڑی ہونگی۔ باایں ہمہ میری استقامت کا یہ حال ہے کہ ابتک چوری سے باز نہ آیا۔ جب کوڑے کھا کر جیل خانے سے نکلا سیدھا چوری کی تاک میں چل دیا۔ میری استقامت کا یہ حال شیطان کی طاعت میں رہا ہے۔ دنیا کی خاطر۔ افسوس تم پر اگر اللہ کی محبت کی راہ میں اتنی استقامت بھی نہ دکھلا سکو اور دین حق کی خاطر چند کوڑوں کی ضرب برداشت نہ کرو۔ میں نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہا۔ اگر حق کی خاطر اتنا بھی نہ کرسکے جتنا دنیا کی خاطر ایک چور اور ڈاکو کر رہا ہے تو ہماری بندگی پر ہزار حیف اور ہماری خدا پرستی ہی بت پرستی لاکھ درجہ بہتر

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا!

---

[1] "عزہ" کی باتیں سنتے تو اس کے آگے رکوع و سجود میں منہ کے بل گر پڑتے

سے بھی بالاتر ہیں تمہارے لئے یہی بہت ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ایمان کی بچی بچپائی اور
بچی کھچی پونجی بچا لیجاؤ۔ اگرچہ اس کی بھی امید نہیں:

تو اے گرد تو تہم اشوکت دریا چہ میدانی؟

اسیر عذر لنگی، وسعت صحرا چہ میدانی؟

تم کہتے ہو دیدہ و دانستہ اپنی جان ہلاکت میں ڈالدینا کون سی عقلمندی اور کہاں کی حق پسندی
ہے؟ بلکہ ایک طرح کی ضلالت وجنون ۔حتی تکون حرضا او تکون من الھالکین[1]۔
تو تمہاری مثال ٹھیک لائمات مصر کی سی ہے جو جمال عصمت یوسفی سے بیخبر امرأۃ العزیز
کو ملامت کیا کرتی تھیں۔ تراود فتاھا عن نفسہ قد شغفھا حبا۔ انا لنراھا فی ضلال
مبین[2]۔ لیکن کاش ایسا ہوتا کہ پردہ اٹھایا جا سکتا اور یہ کہا جا سکتا کہ اخرج علیھن[3]! تو
اس وقت ملامت گران بے درد پر اپنی ملامتوں کی حقیقت کھلتی۔ لائمات مصر نے تو صرف
ہاتھ ہی کاٹ لئے تھے۔ اکبرنہ۔ وقطعن ایدیھن وقلن حاشا اللہ ما ھذا بشرا ان
ھذا الا ملک کریم[4]۔ لیکن عجب نہیں تمہارے ہاتھوں کی چھریاں خود تمہارے ہی گردنوں پر
چل جائیں اور اس وقت دل باختگان عشق یوسفی کہنے۔ فذالکن الذی لمتننی فیہ[5]!

---

(۱) یہاں تک کہ تو قریب المرگ ہو جائے یا بالکل ہلاک ہو جائے۔

(۲) وہ اپنے غلام کو پھسلاتی ہے کہ جس نے اُسے موہ لیا ہے، ہم تو اسے صریح گمراہی میں سمجھتے ہیں۔

(۳) اُن کے سامنے نکل آ۔

(۴) اُس کی قائل ہوگئیں اور اپنے ہاتھ چھریوں سے کاٹ لئے اور کہنے لگی حاشا اللہ۔ یہ آدمی نہیں ہے یہ تو بس فرشتہ ہے
(یہاں ایک نہایت محققانہ حاشیہ عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے کے متعلق تھا؛ "تذکرہ" میں دیکھو)

(۵) تو یہی وہ ہے جس پر تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔

سے چور اور خون سے رنگین ہو رہا تھا، اُسی کے آگے جبین نیاز جھکی ہوئی! اُسی کے ذکر میں قلب و زبان لذت یاب تسبیح و تحمید اُسی کے جلوۂ جمال میں چشم شوق وقف نظارۂ دیدار اور اُسی کی یاد میں روحِ مضطر محو و سرشار عشق و خود فراموشی!

یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

اور پھر جو امام موصوف نے افطار سے انکار کر دیا۔ اور نماز کا وقت آیا تو یہ اول وقت و بہ جماعت ادا کرنے سے باز نہ آئے حالانکہ جسم زخموں سے چور اور پیٹھ کا خون پاؤں تک بہ رہا تھا، تو اب بتلاؤ وہ تمہارا رخصت والا معاملہ کیا ہوا؟ کیا ایسی حالت میں رخصت نہ تھی کہ روزہ کھول دیتے اور نماز کے لئے اس قدر توقف کرتے کہ زخموں پر مرہم لگا دیا جاتا؟ اور اگر تم اس عالم میں ہو کہ امن و فراغت اور طاقت و فرصت کی حالت میں بھی مصائب و خطرات سے بچنے کے لئے دعوتِ الی الحق کو ترک و ملتوی اور عزم و ثبات حق سے انحراف کیا جا سکتا ہے اور تمہارے نزدیک مصلحت و رخصت اسی میں ہے کہ باطل و ضلالت کے آگے سر جھکا دیا جائے، تو خدارا بتلاؤ کہ یہ عالم کون سا تھا؟ کبھی اس عالم کی بھی کوئی خبر تم تک پہونچی ہے؟

یاران خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست!

فسوس حیلہ جوئی و بہانہ سازی کا نام تمہاری بولی میں رخصت ہے، اور ہمت کی موت [illegible] کی جا سکو کو تمہاری پستی میں مصلحت بینی اور دانشمندی کے لقب سے پکارا جاتا ہے [illegible] ہم اور ہمت آباد عشق کے معاملات تمہارے وہم و گمان

reverence for womanhood and obedience to Dharma on the part of women Such reverence for womanhood is made a source of uplift for men as well as women by being kept within bounds under the inspiration of a higher reverence the reverence for Dharma as the command of God.

4 Manu warns us against disobedience to Dharms in the matter of marital duties etc., because it results in the loss of those family virtues and graces which are the result of centuries of self-restrained culture.

कुविवाहैः क्रियालोपैर्वेदानध्ययनेन च ।
कुलान्यकुलतां यान्ति ब्राह्मणातिक्रमेण च ॥

Ch. III 63.

5 The sweetness of family life and the preservation of family virtues which is the only secure basis of national greatness depend upon the existence of *true* and *refined* love The slightest taint in mind is sure to lead to taint in speech and action and to the ultimate corruption of family morality and eventually of national morality Manu says

स्त्रियां तु रोचमानायां सर्वं तद्रोचते कुलम् ।
तस्यां त्वरोचमानायां सर्वमेव न रोचते ॥

Kulluka says in his excellent gloss on this verse.

स्त्रियो ह्यादिना कान्तिमत्यो भर्तृस्नेहविषयतया परपुरुषप्रेमविरहात् तत्कुलं दीप्तं भवति । तस्मात् पुनस्तासामनार्यां भर्तृविद्विष्टतया नरान्तरसम्पर्कात् सङ्करमतः कुलं मलिनं भवति ॥

6 Hence it is that Arjuna points out the tremendous and far reaching consequences of taint in families due to the taint brought in by the corruption of women In no place in the Gita does the *Lord deny this* The Lord goes deeper and gives us the fundamental basis of Dharma and devotion which will bar all such taints from coming in in open or insidious forms Arjuna says that the worst result of taint is *Varna Sankara* Individual unhappiness and impurity and even the loss of family virtues and graces are of limited application in time and space compared with that utter un loosening of social bonds and that utter confusion of births and social gradations which are implied in the term *Varna Sankara* the import and importance of which we must fullyunderstand if we want to understand the Hindu scheme of life

7 This is not the proper occasion to deal at length with the real spirit of the Hindu institution of caste Whatever be the worthlessness of the miserable travesty of it that is now prevalent in modern India, there is no doubt that it preserved the Hindu civilisation from being overborne by the

forces of barbarism and disorder within and without Such an unsympathetic observer of men and manners in India like Abbe Dubois says "I believe caste division to be in many respects *chef d'œuvere*, the happiest effort of Hindu legislation I am persuaded that it is simply and solely due to the distribution of the people into castes, that India did not lapse into a state of barbarism, that she preserved and perfected the arts and sciences of civilisation, while most other nations remained in a state of barbarism . Such an institution was probably the only means that the most clear-sighted prudence could devise for maintaining a state of civilisation "

8 The principle of the caste system is social co-operation on a federal basis It enables the society to conserve and perfect hereditary aptitudes It prevents those terrible social unsettlements that are sure to result from frequent encroachments by one social group upon the occupations and pursuits of another It does not take away the incentive to exertion because under the caste system as created and preserved, the four social groups were so strong numerically that efficiency and energy had always free play and free scope for self-manifestation and self-development in the best interests of the nation as a whole. All possibility

of friction due to a tyrannical sense of superiority was taken away by directing the gaze of every man upon his duties rather than upon his rights. Similarly all possibility of friction due to the pride of numerical superiority was eliminated by pointing out that each man must reap the fruit of his own actions independently of others though all might co-operate here and delight in doing evil things. Not a single co-operator in the doing of evil will or can offer the slightest help to save us from the consequences of our sin. Above all each man's gaze was perpetually drawn to the centre of God and he had no time to dig holes to push and bury alive his brother-man or his sister-woman. It was also declared that a devout and pious Panchama is dearer to the Lord than a proud Brahmin learned but destitute of the love of God. As Prahlada says in his lyric outburst of devotion in the VII th skandha of the Bhagavata.

> विप्राद्द्विषड्गुणयुतादरविन्दनाभ
> पादारविन्दविमुखात् श्वपचं वरिष्ठम् ।
> मन्ये तदर्पितमनोवचनेहितार्थ
> प्राणं पुनाति स कुलं न तु भूरिमानः ॥

9. This subject will be dealt with later on in detail in considering verse 18, Chapter IV. The word

Varna has been grossly misunderstood by modern interpreters of our sacred books—more often by so-called scholars within our fold than by the Western *savants* This is due to an unmeaning hatred of the caste system rather than to a clear-sighted and impartial investigation of the truth I shall discuss the meaning of *Varna* more fully later on. Suffice it to say here that it does not mean letter or colour or description It means the commingling of *sattva*, *rajas*, and *tamas* in different degrees. But this does not mean any special superiority or inferiority Individual effort and in a large degree early nurture might nay, certainly would so alter the initial endowments of the *gunas* that when a man comes to the age when he can effectively serve his country and better his own personality, the man who was born in a higher group as the result of past *karma* would not be able to bear comparison for a moment with the man who happened to be born in a lower group Also there might be instances of great souls fit in every way to adorn a higher group being born in a lower group as the result of specific transgressions in other births Hence the notion of superiority and inferiority if it finds lodgment in the heart of any man will surely lead to his undoing, and further cause serious social dislocation and untold social misery The burden of

service laid upon each group is in direct ratio to its place in the social hierarchy Hence every man born in a higher group ought to feel the insecureness of his position keenly because every act of commission and omission will be duly visited with results which could not be easily averted or mitigated

10 Hence as students of this sacred book and especially in view of the Lord s declaration in Chapter IV verse 13 we have to take the view that caste had a divine *origin* though it had a social and racial *development* and either approximated to or deviated from the Lord s plan according to the purity or impurity of each age The whole of the Hindu race is one and entire and all fanciful and mythical divisions of it into Aryan and Dravidian Northern and Southern etc. etc. should be rejected with the contempt which such worthless speculation due to hatred of man or love of novelty amply deserve

11 The paramount importance of the preservation of social levels in their integrity and according to the spirit of the Lord s plan is a fact that should never be forgotten Such preservation is in the main due to woman as wife and mother The special injunctions in our sacred books about

the purity of women are due not to a desire to lay on their shoulders a heavier burden than that placed on the shoulder of men but to a desire to preserve the graces and glories of family life and national Dharma For such seemingly differential treatment women are paid in the golden coin of human love by father and husband and children and of divine blessing which gives them not only a sheltered life on earth but also a life of joy in heaven, nay, a wonderful power of even uplifting to the seat of blessedness the husband who might not have deserved the same by his own individual conduct and effort The mother is the special object of adoration in Hindu society because she is the God-given guardian-angel of Dharma The rules laid down in our sacred books about marital choice and marital duty are all inspired by this one solemn feeling of bending all human energies in the service of the preservation of *Dharma*

12. The purity and efficiency of national life depends on the purity and efficiency of family life and the latter eventually and largely depends upon the purity and efficiency of the woman as the guardian of the racial type Woman from the point of view of the present is the beautifier and sweetener of life But from the point of view of

the past she is the preserver of the racial type and from the point of view of the future she is the transmitter of a great inheritance and a precious tradition

13 Since children cannot be choosing their parents the Law of God had to take up this task because if grown up men and women with their souls under the sway of *kama* (passion and desire) were allowed to do as they liked they would mate without reference to any circum stances other than their own unregulated desires and would say as one great man said that "public opinion is a strumpet and posterity is a piece of nonsense' Heredity is a great and potent factor in the welfare of individuals and races and hence it is that public opinion and law have the seeming impertinence to step between a man and his desire

14 The birth endowment of a person and his early training are a strong—in some instances an overpowering—element in the self revelation of his personality and in his development Proper marital choice in accordance with the law of God proper marital life, purity of thought and word and deed on the part of the man and woman who must not be engrossed with the ideas of marital enjoyment but should rejoice in marital duties and marital

creativeness for the sake of the greater happiness of man and the greater glory of God, and proper early training of children who are the golden links of the generations, and the real joys of life, and the evidences of the virile self-renewal of the race and the God-given means of achieving racial immortality these are the vital forces of racial life and any poison admitted there will eventually lead to racial extinction

15 The physical constitution of man is thus a product, a basis, and a force It is derived from various elements which stretch far back into the past and no one can say what sin of which predecessor may not cast its shadow on the mind and body of generations unborn It is a basis because it is through it that we have to pass beyond it शरीरमाद्य खलु धर्मसाधनं It is a force because its purity or impurity has far-reaching consquences. Only God and Dharma who are eternal can watch and regulate and guide us properly and hence it is that Dharma which is the word of God is positive and emphatic on this point

16 Dr Bryce in his Romanes lecture points out that the free admixture of blood between individuals belonging to different communities and living at different levels of civilisation tends in the

long run to diminish the wealth of character and the potency of civilisation which human communities possess The gain of the weaker community is doubtful and small the loss of the stronger community is certain and great Surely there are means of achieving brotherhood other than mingling by marriage The higher and truer and nobler brotherhood is a psychic feeling rather than a physical fact. The former is divine in its nature and hence beyond the fluctuations of time and space and the tyranny of greed and lust The latter is of the earth earthy How many children born of the same parents fly at one another s throats!!!!

17 Herbert Spencer held the view that even races at similar levels of culture but with special peculiarities of racial endowment and racial vision will suffer loss of power through unregulated intercrossing as this will unsettle the stability of the physiological equilibrium of their inherited racial endowments Humanity has achieved great things in the course of centuries of painful travail and cannot afford to allow the momentary whims of individual passion to undo all that had been done while the individuals enjoy the benefit of all that the strivings and sufferings of millions of generations have won for their benefit and their happiness.

18. If one individual in a family goes wrong he might mend or be cast out of it, and in the last resort human life being short his capacity for mischief will have only limited scope and operation If a family in a group goes wrong the evil will be greater but the three possibilities abovesaid apply here also If a group in a society goes wrong the evil will be on a considerable scale but the abovesaid possibilities will apply though with less certainty But if through the decay of faith in and loyalty to Dharma *Varnasankara* sets in and a whole society goes wrong, it cannot right itself and untold suffering and even extinction may follow Such communal mixture will lead to the obliteration of all the great characteristics acquired and preserved through the ages The families composing the corrupted society will be unfit for the reincarnation of great souls awaiting embodiment Thus obedience to the sacred law in this matter is the only means of safeguarding the interests of humanity at large

19 Indeed, if the great evil of *Varna-Sankara* is avoided, the minor evils corrupting family life will be set right in the course of the succeeding seven generations and the society will right itself and preserve its equilibrium despite temporary oscillations and aberrations

20 Hence we can sum up the results of this exposition The Hindu ideal is federation not fusion The integrity and efficiency of society depend on the integrity and efficiency and purity of family life. The preservation of प्रजातन्तु (continuation of lineage) has the physical side of the continuity of generations and the higher spiritual side of the preservation of Dharma The family is the real unit of the State Science tells us that the permanent and happy union of man and woman softened and sweetened life made the continuity and development of civilisation possible, and led to the psychic evolution of man Our view is that if the purity and refinement of the family are preserved and the graces and benedictions of the *samskaras* are attained a perfect Brahma Jnani would be born in the family and the light of sainthood in him will illuminate the world and uplift the generations preceding and following him This is the positive side The negative side is that *Varna Sankara* will have the various results stated above and will result in racial extinction If we add to the impurities in past births the impurities of family corruption and social taint, who can save us? If our parentage gives us an endowment of purity and power and if the society contributes its electric currents of dynamic purity of ideals we can counteract the

evil tendencies in us and with the help of Dharma attain to the lotus feet of God

संकरो नरकायैव कुलघ्नानां कुलस्य च ।
पतन्ति पितरो ह्येषां लुप्तपिण्डोदकक्रियाः ॥ ४१ ॥

दोषैरेतैः कुलघ्नानां वर्णसंकरकारकैः ।
उत्साद्यन्ते जातिधर्माः कुलधर्माश्च शाश्वताः ॥ ४२ ॥

उत्सन्नकुलधर्माणां मनुष्याणां जनार्दन ।
नरके नियत वासो भवतीत्यनुशुश्रुम ॥ ४३ ॥

Such confusion of births leads to hell the destroyers of the family and also the family The ancestors of such persons fall owing to deprivation of the offerings of food and water. By such sins which result in the degradation and destruction of families and which bring about confusion of castes, the eternal family virtues and duties and caste virtues and duties become extinct O Janârdana, we have heard it said that men whose family virtues and duties have become extinct will undoubtedly dwell in hell

NOTES

1. The importance of offerings of food and water in the manner prescribed by the scriptures

is a fact that will be patent to any one who understands the Hindu scheme of life A beautiful Sanskrit verse says—

जीवतोवाक्यकरणात्क्षयाहे भूरिभोजनात् ।
गयायां पि ड दानाच त्रिभिर्पुत्रस्य पुत्रता ॥

The divine beings known as *Vasurudradityas* accept the food offered to the Brahmins who represent them and give nutriment in a suitable form to the ancestors in whatever embodiment they may be. It is said that there are 96 *sraddhas*

2 It may not be out of place here to say what Max Muller says about the Hindu Sraddha ceremony He says I deeply sympathise with your sraddha ceremony nay I wish we had something like it in our own religion To keep alive the memory of our parents to feel their presence during the great trials of our life to be influenced by what we know they would have wished us to do, and to try to honour their name by showing ourselves not unworthy bearers of it, that is a Sraddha ceremony in which we can all partake nay ought to partake whatever our religion may be There is a real though unseen bond of union (*tantu*) that connects us through our parents and ancestors with the great Author of all things, and the same bond

will connect ourselves through our children with the utmost distant generations. If we know that, and are constantly reminded of it by ceremonies like that of your Sraddha, we are not likely to forget that responsibility that rests on every one of us In that sense your Sradh is a blessing, on your parents because on yourselves, and whatever the future of your religion may be in India, I hope this communion with the spirits of your ancestors or *Pitris*, will always form an essential part of it"

3 I need hardly say that modern reformers of all degress of conformity to reason and non-conformity to revelation (old and new? I am speaking thus because new Dharma Sastras and Gitas etc, etc, etc, are now being sprung upon us) who give up the Sraddhas or lessen their importance in our scheme of social and spiritual life are not Hindus in fact

4. The story of Astika in the Mahabharata makes us realise clearly the position of progenitors who leave no proper descendants

5 Hence the destruction of family and caste duties, virtues and graces due to confusion of births is a serious menace to individual and social welfare and is the greatest of all foes to the spiritual

foundation of a stable social life It must be prevented at any cost

> अहो बत महत्पापं कर्तुं व्यवसिता वयम् ।
> यद्राज्यसुखलोभेन हन्तुं स्वजनमुद्यताः ॥ ४४ ॥

Alas! Alas! we have resolved upon committing a great far reaching sin by seeking to kill our kinsmen out of greed for the pleasures of sovereignty

> यदि मामप्रतीकारमशस्त्रं शस्त्रपाणयः ।
> धार्तराष्ट्रा रणे हन्युस्तन्मे क्षेमतरं भवेत् ॥ ४५ ॥

If the armed sons of Dhritarashtra are to slay me unarmed and unresisting, that will be the higher blessing to me

NOTES:

Arjuna s idea is that his individual suffering would be nothing in comparison with the great communal and racial evils consequent on the decimation of families and social unsettlements caused by such a war

सञ्जय उवाच—

> एवमुक्त्वार्जुनः संख्ये रथोपस्थ उपाविशत् ।
> विसृज्य सशरं चापं शोकसंविग्नमानसः ॥

Sanjaya said -

Having spoken thus on the battlefield, Arjuna sat down in the back seat of his car having cast aside his bow and arrows, with mind overpowered by sadness.

NOTES

1 Such a mood of mind is natural in the case of those who though they are warriors by heredity, training, profession, and inclination, have their humaner side also developed by a self-disciplined and self-controlled ethical life

2. Arjuna's nobility of nature is shown by the grand and unique spectacle of his selflessness' even in his unworthy and *anadharmic* and unmanly mood of grief His view was that the universal slaughter impending and inevitable on the battlefield will deprive his side of real happiness even if it won the war, because the kinsman whose participation in the pleasures and enjoyments of life was the really valuable element in them would be slain in the war Not merely was there this result alone There would be not merely appalling waste of life and the blighting of all sources of real happiness, but the whole country and society would be overwhelmed by sin The mere

disappearance of one generation was only like the subsidence of one wave on the infinite ocean of time The blighting of the real elements of joy in life to one generation was of limited scope and duration But the sin that arose like a moral epidemic from the field of war was sure to leave its devastating effect on many societies and during many centuries. Nay it would have far reaching consequences not merely in regard to our succes sors but also in regard to our predecessors The sin resulting from the slaughter would be of various kinds and degrees and intensities of evil conseque-nces There is first of all the taking away of life thence follows the extinction of families thence follows the loss of the white radiance of purity in the womanhood of the race thence follows the inevitable confusion of births and functions and duties the ancestors whose original rites are neglected or are performed by unworthy hands fall from their high estate the young men of the race have not the guidance of the wisdom of the elders of the race and the bonds of society get loosened and Adharma reigns in the place of Dharma which is the regulative principle of the higher life and a great racial type designed by God to be the fitting home for the reincarnation

of great souls is in danger of disappearance and final extinction.

3. Hence in spite of his grief and illusion, his tenderness and nobility of nature and his clarity of vision as to the far-reaching social consequences of individual actions are clear from his words The fallacy in his argument was that he brought into his statement an obtrusion of the individualistic attitude towards life and towards the solemn tasks and duties of life, that he was obsessed by a concentration of his mind upon the consequences of actions instead of doing his work in a spirit of detachment and as an act of worship to God, that he did not realise that Duryodhana and his followers were fighting against Dharma whereas the tie of kinship is of no importance if it is weighed in the balance of the Divine Law against Dharma, that if he did not do his duty the evil consequences to him, to his ancestors, to his successors, and to society would be even greater than the consequences of slaughter in war, and that if duty was done in the right spirit the Lord who is Love as well as Law might be left to attend to the conservation and preservation of racial power and fruitfulness.

4 Some say that Arjuna was under illusion though he was full of tenderness and spoke words

CHAPTER II

Sankhya-Yoga

In this Chapter the Lord deals with the major as well as the minor difficulties that clouded Arjuna's faculties and unnerved and paralysed his will As Arjuna's difficulty was fundamental in its nature, Sri Krishna also went to the root of the matter A mere presentation of the doctrine of the blessedness of duty from its outward side would not have convinced Arjuna that his true glory and blessedness lay in his doing his duty in the proper spirit Mere command or exhortation would not have effected that conversion of the heart without which commands and exhortations are but of limited effect, even if they be not entirely in vain It was Arjuna's non-perception of the real nature of the soul and of the real means of realising it that was the cause of his obscurity of vision, his confusion of the real issues, and his shrinking from the call of duty The divine physician therefore has treated the malady of the soul by attending to the root-cause as well as the symptoms, and as already explained by me in my general introduction the Lord's method is both natural and effective

Sri Sankara points out that in the first Adhyaya we are shown that *Soka and Moha* etc. (grief and illusion) are the real cause of our lack of self poise in a state of perfection and bliss Arjuna s attachment to the bodies of his relations his mental pre-occupations with the pleasurable or painful results of his actions and his obtrusion of the little self into the concerns of life resulted in his giving up his God given duty and trying to take up the duty of an ascetic and a monk In Sri Sankara s words

तथा च सर्वप्राणिनां शोकमोहादिदोषाविष्टचेतसां स्वभावत एव स्वधर्मपरित्यागः प्रतिषिद्धसेवा च स्यात्। स्वधर्मे प्रवृत्तानामपि तेषां वाङ्मनःकायादीनां प्रवृत्तिः फलाभिसंधिपूर्विकैव साहंकारा च भवति।

Hence the Lord teaches the true nature of the soul and the means of realising the same

In Sri Yamunacharya s *Gitartha Sangraha* the lessons of this Adhyaya are summed up thus:

नित्यात्मासङ्गकर्मेहागोचरा सांख्ययोगधीः।
द्वितीये स्थितधीलक्षा प्रोक्ता तन्मोहशान्तये॥

(For dispelling his illusion there is stated in he second Chapter the immortality of the soul the twin paths of knowledge and action based on the doing of duty in a spirit of detachment and the state of the man of self poised and self possesse l soul)

सञ्जय उवाच

तं तथा कृपयाविष्टमश्रुपूर्णाकुलेक्षणम् ।
विषीदन्तमिदं वाक्यमुवाच मधुसूदनः ॥ १ ॥

Sanjaya said .

To him thus overcome by pity, with vision obscured by brimming and hurting tears, and full of sorrow, Madhusoodana spoke these words.

NOTES

1. Some say that Sanjaya said the above words to prevent Dhritarashtra from rejoicing that thus his sons would get an easy victory and achieve the triumph of evil in the world But we must remember that this episode occurs after the fall of Bhishma as stated already by me

2. कृपया-- The tenderness of Arjuna was a selfish feeling and not a divinely unselfish feeling. He was thinking that he would lose all the possibilities of real joy in life by the slaughter of his kith and kin. His feeling was not that feeling of divine love which has no thought of self and desires only to wipe out the tears of others and dower them with supreme happiness. It was after all कृपा and not दया

3. कृपयाविष्टं, This shows that it dominated him. It is treated as an active agent and he is

described in the accusative case Madhusoodana says:

अर्जुनस्य समर्थं कृपाविष्टत्वं वदता तस्या आगन्तुकत्वं सूचितम् ।

4 विषीदन्तम् विषादं प्राप्नुवन्तम् Here विषाद is the object and the word makes it clear that the grief was an intruder and not a real element.

अत्र विषादस्य कर्मत्वेनार्जुनस्य कर्तृत्वेन तस्यागन्तुकत्वं सूचितम् ।

श्री भगवानुवाच—

कुतस्त्वा कश्मलमिदं विषमे समुपस्थितम् ।
अनार्यजुष्टमस्वर्ग्यमकीर्तिकरमर्जुन ॥ २ ॥

The Lord said—

O Arjuna whence has come upon you at this inopportune moment this weakness of dejection—which is never allowed by the high souled ones, which bars the path to heaven, and which will destroy your fair name

NOTES

1 *Bhagavan* means the Lord possessed of the fullness of the six auspicious qualities—the Omniscient and the Omnipotent.

ऐश्वर्यस्य समग्रस्य धर्मस्य यशसः श्रियः ।
वैराग्यस्याथ मोक्षस्य षण्णां भग इतीरणा ॥

उत्पत्तिं च विनाशं च भूतानामागतिं गतिम् ।
वेत्ति विद्यामविद्यां च स वाच्यो भगवानिति ॥

2 कश्मल (dirt) is used in contrast with अर्जुन (white) How can there be any dirty spot in a nature of such white and spotless purity? Arjuna says to Prince Uttara about himself and his stainless purity of action

पृथिव्यां चतुरन्तायां वर्णो मे दुर्लभः समः ।
करोमि कर्म शुद्धं च तेन मामर्जुनं विदुः ॥

3 The Lord says that Arjuna's कृपा instead of being praiseworthy and meritorious is ignoble, heaven-barring, and reputation-destroying As Madhusoodana tersely puts it,

तथा च मोक्षकामैः स्वर्गकामैः कीर्तिकामैश्च वर्जनीयम् ।

क्लैब्यं मा स्म गमः पार्थ नैतत्त्वय्युपपद्यते ।
क्षुद्रं हृदयदौर्बल्यं त्यक्त्वोत्तिष्ठ परंतप ॥ ३ ॥

Do not get into this state of impotence, O Partha. It doth not befit thee. Shake off this low faint-heartedness, and rise, O vanquisher of foes.

NOTES

1 क्लैब्य Probably the Lord tells him in a banter that though he assumed the disguise of a

eunuch in Virata's court he must not be a eunuch in fact in the presence of a great crisis.

2. पार्थ Kunti had sent him a message to behave like a true Kshatriya The word probably refers to it and suggests that he should carry out his mother's command

3 The Lord refers in this verse to Arjuna's statement न च शक्नोम्यवस्थातुं भ्रमतीव च मे मनः। He asks him to call to mind his prowess which enabled him to vanquish his foes and meet in battle Maheswara Himself

4 Thus the Lord appeals first to Arjuna's chivalry and prowess because an appeal to a man's natural inclination is the best means of overcoming a strange temporary depression

अर्जुन उवाच—

> कथं भीष्ममहं संख्ये द्रोणं च मधुसूदन ।
> इषुभिः प्रतियोत्स्यामि पूजार्हावरिसूदन ॥ ४ ॥

Arjuna said —

How, O Madhusoodana shall I attack with arrows in battle Bhishma and Drona who are worthy of my worship, Oh slayer of foes !

Notes

1 Here Arjuna states as his strongest ground the sin of attacking those worthy of reverence, and places in the background the doubtfulness of victory in battle, the loss of life's enjoyments through the slaughter of kindred, etc How shall I, he says, shower arrows on them on whom I should shower the sweetest flowers of reverence and adoration? Is not irreverence for elders a great sin, as is stated in the verse गुरुं हुंकृत्य त्वंकृत्य etc ?

गुरूनहत्वा हि महानुभावान्
श्रेयो भोक्तुं भैक्षमपीह लोके ।
हत्वार्थकामांस्तु गुरूनिहैव
भुञ्जीय भोगान् रुधिरप्रदिग्धान् ॥ ५ ॥

It is far better in this world to eat what is got by begging without killing our honoured and high-souled elders By slaying these elders who are attached as yet to worldly enjoyments, we should taste here alone enjoyments vitiated by the shedding of blood.

Notes

1. Arjuna says that wading through slaughter to a throne and shutting the gates of mercy on

mankind leads to ill consequences here and hereafter

2 This verse is an answer to a possible argument that the elders have transgressed their bounds of duty and cannot be treated with the reverence due to them if they were in the right path. It is said in the Ramayana

गुरोरप्यवलिप्तस्य कार्याकार्यमजानतः ।
उत्पथप्रतिपन्नस्य परित्यागो विधीयते ॥

But Arjuna says that by not punishing elders by attack we could ensure enjoyment of a life in heaven whereas by attacking them we get only a bloodstained sovereignty and nothing more

3 The second half of the stanza deals with an assumed objection Bhishma had once said that he was fettered to the unjust cause of Duryodhana by being his state servant and accepting remuneration for his service He had said

अर्थस्य पुरुषो दास दासस्त्वर्थो न कस्यचित् ।
इति सत्य महाराज बद्धोऽस्म्यर्थेन कौरवै ॥

But Arjuna says that in spite of this the elders were his superiors in every way and should not be attacked by him

4. Or अर्थकामान् may be taken as qualifying भोगान् Then the verse will mean By slaying these

elders, we should taste here alone enjoyments consisting of wealth and pleasure dipped in blood" This interpretation obviates the necessity of giving a reason for calling the elders अर्थकामान् after having described them as महानुभावान् in the first half of the stanza

5 श्रेय. This word is used to mean the higher raptures of the spirit as opposed to the lower enjoyments of the senses (प्रेय) In the Kathopanishad it is stated

अन्यच्छ्रेयोऽन्यदुतैव प्रेयस्ते उभे नानार्थे पुरुषं सिनीत । तयोः श्रेय आददानस्य साधुर्भवति हीयतेऽर्थाद्य उ प्रेयो वृणीते ।

श्रेयश्च प्रेयश्च मनुष्यमेतस्तौ सपरीत्य विविनक्ति धीरः । श्रेयो हि धीरोऽभिप्रेयसो वृणीते प्रेयो मन्दो योगक्षेमाद्वृणीते ।

6 हिमहानुभावान् explained also as one word.

हिमं जाड्यमपहन्तीति हिमहा आदित्योऽग्निर्वा तस्येव अनुभाव. सामर्थ्यं येषा तान् ॥

This means 'those whose splendour and glory and power are like those of the Sun'

न चैतद्विद्मः कतरन्नो गरीयो
यद्वा जयेम यदि वा नो जयेयुः ।
यानेव हत्वा न जिजीविषामः
तेऽवस्थिताः प्रमुखे धार्तराष्ट्राः ॥ ६ ॥

Nor do we know which is the better for us—that we conquer them or that they conquer us The sons of Dhritarashtra after killing whom we cannot care to live, are arrayed against us in mortal battle

NOTES.

1 Some take the first line of the verse as asking who is the stronger among us—they or we ? अभ्यस्तौ हि दृश्येत युद्ध जयपराजयौ says the Ramayana Others take it as asking which is better—mendicancy where there is no taking of life or war which is our duty? Arjuna however seems to be revolving in his mind the relative value of victory and defeat He thinks that by victory he will gain Artha and Kama and lose Dharma and Moksha besides losing his kith and kin—a circumstance which will poison his enjoyment of Artha and Kama

2 It is hence,—so thinks Arjuna—better far to retire from war and beg his food than to fight the battle and reap such disastrous consequences Perhaps he had in mind the truth contained in the verse which says that great is even the trifle earned without causing harm to others and without seeking the favour of bad men and without over working oneself

अकृत्वा परसंतापं अगत्वा खलमन्दिरम् ।
अक्लेशयित्वा चात्मानं यदल्पमपि तद्बहु ॥

कार्पण्यदोषोपहतस्वभावः
पृच्छामि त्वां धर्मसंमूढचेताः ।
यच्छ्रेयः स्यान्निश्चितं ब्रूहि तन्मे
शिष्यस्तेऽहं शाधि मां त्वां प्रपन्नम् ॥ ७ ॥

My natural tendency is clouded by faintness of heart and weakness of will, and my mind is confused in regard to my duty. I ask thee for light. Tell me decisively which is the auspicious path. I am thy disciple; to me, who have thrown myself at thy feet seeking grace, reveal the truth and command me as to what I shall do.

Notes

1. Madhusoodana Sarasvati points out how Arjuna has shown himself as one who had acquired *sama*, *dama* etc. the fourfold pre-requisite for spiritual illumination called साधनचतुष्टय.

He says:

'न च श्रेयोऽनुपश्यामि हत्वा स्वजनमाहवे' इति नित्यानित्यवस्तुविवेको दर्शितः, 'न काङ्क्षे विजयं कृष्ण' इत्यत्र ऐहिकफलविरागः, 'अपि त्रैलोक्यराज्यस्य हेतोः' इत्यत्र पारलौकिकफलविरागः, 'नरके नियतं वासः' इत्यत्र स्थूलदेहातिरिक्त आत्मा, 'किं नो राज्येन' इति

भाष्यावतरणेना ग्रमः, 'किं भोगैः' इति एव 'पश्यामि न पश्यन्ति' श्लोक निर्देशिता, 'तन्मे श्रेयतरं भवत्' इति अत्र विविक्षा, इति ग्रन्थ भाष्यावतरणेः तदन्यावगापनपूर्वकम् । भाष्यितव्याय यथा भोगम् नैष्कर्म्यपि' श्लोक भिक्षाचर्यापि उपदिष्टः सन्याय प्रतिपादित । गुरूणाम् हनमिति तत्र प्रतिपादते, धर्मपिण्डदानादोषस्य अतिधरो निर्दिष्टस्य विधिवहुत्प्रायपसेन विद्यामहत्त्वार्थपकारात् ।

2. I have already shown how *rejas* means the auspicious path leading to God love and God realisation the only medicine for all the ills of life

3. कृपण This word is used to describe a miser a man in mental distress, a slave The word is used by Arjuna to show how he is doting over the fleeting treasure of family affections how his mind is tossed on the seas of irresolution by the storms of doubt and how he is a slave to the ties of blood We should remember also that in the Upanishads a कृपण is defined as one who dies without having attained God realisation

'यो वा एतदक्षरं गार्ग्यविदित्वास्माल्लोकात्प्रैति स कृपणः'

Says Scripture It is this that has obscured Arjuna's vision (स्वभाव) If that is removed his true nature will shine forth

4 शिष्य —True knowledge will come only to a humble disciple and from a true Guru. See Gita IV 34

5 प्रपत्ति—The nature of Prapatti or शरणागति. is thus stated

आनुकूल्यस्य सङ्कल्पः प्रातिकूल्यस्य वर्जनम् ।
रक्षिष्यतीति विश्वासः गोप्तृत्ववरणं तथा ॥
आत्मनिक्षेपकार्पण्ये षडङ्गा शरणागतिः ।

न हि प्रपश्यामि ममापनुद्या-
 द्यच्छोकमुच्छोषणमिन्द्रियाणाम् ।
अवाप्य भूमावसपत्नमृद्धं
 राज्यं सुराणामपि चाधिपत्यम् ॥ ८ ॥

Verily I do not see what will remove this anguish that withers up my senses, even if I should attain unchallenged sovereignty on earth or even the rulership over Gods.

NOTES

1 What is the good of blessings here or in heaven to him whose soul is ill at ease ? What profiteth it a man if he wins the whole world and loses his soul ? Such is Arjuna's anguished feeling Even the joys of heaven end after a time

'तद्यथेह कर्मचितो लोकः क्षीयत एवमेवामुत्र पुण्यचितो लोकः क्षीयते' says Scripture

2. He prays therefore to be led across the Slough of despond to the City beautiful.

'[illegible] भगवान् [illegible] ।—
says Scripture

3. This verse is his answer to the Lord's words [illegible] ।

सञ्जय उवाच—

> एवमुक्त्वा हृषीकेशं गुडाकेशः परन्तप ।
> न योत्स्य इति गोविन्दमुक्त्वा तूष्णीं बभूव ह ॥ ९ ॥

Sanjaya said —

Having thus advised Hrishikesa Gudakesa the conqueror of his foes, said to Govinda "I shall not fight" and then became silent

NOTES

1 But it was a silence that awaited illumination and prayed for it as he did not go away from the field of battle.

2 Thus in this प्रपत्ति he turns for help to his guru the guru of all gurus the Adi Guru Sri Narayana himself The disciple must preserve his individuality and at the same time humbly ask for illumination using his individuality to present all his difficulties to the teacher and get them solved This was Arjuna's method

> तमुवाच हृषीकेशः प्रहसन्निव भारत ।
> सेनयोरुभयोर्मध्ये विषीदन्तमिदं वचः ॥ १० ॥

Then Hrishikesa, with an apparent smile on his lips, spoke O Bharata, these words to him who was over-whelmed by grief in the midst of both the armies

NOTES

1 प्रहसन् इव This is understood in various senses Nilakantha takes it to mean that the Lord smiled as Arjuna spoke as if he were wise though he was not wise Madhusoodana says that the Lord wanted to make Arjuna feel ashamed of his inopportune words and actions and qualifies this remark by saying that this was only a prelude to his instruction Dhanapati takes it to mean that it was a reassuring smile implying that he was prepared to instruct and bless him Others say that the smile shows the good temper of the born teacher and the indication of the teacher's mastery over his subject Sridhara says that प्रहसन् — इवप्रसन्न-मुखः सन् The lips and the eyes are the most expressive portions of a beautiful face That is why the poets and saints praise the Lord's करुणाकटाक्ष and मन्दहास Mookakavi has devoted 100 verses to each of them The words show that the Lord was then in his benignant (प्रसन्न) aspect The beauty of his divine smile showed his प्रसन्नता He was ready to shower His grace प्रसाद on Arjuna, his disciple and devotee

2. सेनयोरुभयोर्मध्ये may qualify also उवाच This will show that the Lord in His abundance of grace and eagerness to uplift and save ignored the unsuitability of the place for the giving of his gospel.

श्रीभगवानुवाच—

अशोच्यानन्वशोचस्त्वं प्रज्ञावादांश्च भाषसे ।
गतासूनगतासूंश्च नानुशोचन्ति पण्डिताः ॥ ११ ॥

The Lord said —

Thou grievest for those that should not be grieved for and yet thou speakest words of seeming wisdom The really wise who have attained the knowledge of the soul do not grieve for the living or for the dead

NOTES

1 Arjuna s grief and illusion have led to his abandoning his plain duty and trying to do what is not his duty but is the duty of an ascetic. So long as grief and illusion haunt us they would mislead us away from the path of duty and would make us work with motives even if we are in the path of duty Hence in this verse the Lord goes to the basic evils and removes them The teaching of Arjuna was merely an occasion to give the blessed gospel to all the world Sri Sankaracharya says

further that only jnana is the means to liberation.

2 Nilakantha speaks of the twenty verses beginning with this verse thus ब्रह्मविद्यासूत्रभूतैः विंशत्या श्लोकैः। He says that Arjuna had two illusions

i That the soul was destroyed when the body was killed

ii That his duty of righteous war was an *adharma*. By these twenty verses the first illusion was removed. Madhusoodana thinks that the first illusion was shared by Arjuna with the rest of mankind and that the second illusion was peculiar to himself. There is no room for grief as the soul is eternal

3. अशोच्यान् This means that he grieved in respect of that which, being eternal, should not be grieved for. The Sruti says. जीवापेतं वाव किलेदं म्रियते नाजीवो म्रियते ।

4. प्रज्ञावादांश्च Some take it to mean that Arjuna spoke *words* of wisdom but did not act wisely Others take it to mean that what he said was only seemingly wise. Madhusoodana splits up the word into प्रज्ञा+अवादान् (words which the wise would not utter) Both the meanings express two different aspects of the same thing

5 नतासून् Sri Ramanuja takes this to mean bodies अ ताप्लून् च Sri Ramanuja takes this to mean souls.

This lays stress on the fact that the body is mortal and not worth grieving for and that the soul is immortal and not to be grieved for at all उभमो मातुपेा देहो दहिनां क्षनमहुर ।

6 पण्डिता Those learned in the science of the soul, Sri Sankaracharya says पण्डा आत्मविषया बुद्धि येषां ते हि पण्डिता ।

7 Sri Madhwa takes च in भगतासूंश्च to mean एव Then the verse would mean that just as no one grieves for the living so no one should grieve for the dead knowing the eternal nature of the soul

न त्वेवाहं जातु नासं न त्वं नेमे जनाधिपाः ।
न चैव न भविष्यामः सर्वे वयमतः परम् ॥ १२ ॥

Never was there a time when I and you and these kings were not. Neither shall there be a time when all of us shall cease to be

NOTES

1 This is a telling statement about the soul being different from the body and being immortal The body had a time when it was not, and there

will be a time when it will not be The nature of the soul is quite different.

2 The Lord gives the instance of God for purposes of comparison and shows that the human soul is eternal in the same sense as the Oversoul.

3. The Dwaita and the Vishistadwaita schools of thought rely on this verse as proving the multiplicity of souls and their separateness from God, as God, Arjuna, and the kings are referred to separately But the context shows that the Lord is teaching here the eternity of the soul and its separateness from the body and not with the relations between the soul and the Oversoul I shall deal later on with the inter-relatedness of the three schools of thought and state what, in my humble opinion, are the real and apparent points of difference between them and show that the present attempts to demonstrate their utter irreconcilableness have a basis of prejudice rather than a basis of reason or fact

4. Sri Sankaracharya says that the plural is used here to show that the seeming difference is due to difference of bodies देहभेदानुवृत्त्या बहुवचनं नात्मभेदाभिप्रायेण ।

5 If the verse is to be taken literally so as to justify the affirmation that the souls are sepa-

rate can we argue logically and say that the soldiers have no souls because they are omitted in the verse while the leaders are mentioned and that the Lord is in no sense superior to us as He and the souls are mentioned as being alike? The Lord is dealing with the truth of things beginning from Arjuna's point of view and we find a natural development of ideas throughout the Chapter

6 Mr C M Padmanabhachariar asks Why should not the Lord say that all are one and that there is no duality! Was He deficient in expression and did He teach dualism when He meant monism and leave Arjuna to twist His words and distil or evolve monism out of them? The fact is that the Lord did not come into the world to propound this or that school of philosophy but to give us a full unitive vision of truth. It is only our mental prejudice that incites us to make each stanza sing to the tune of our preconceived views

7 One argument advanced against the adwaitist position is that if all are one how could there be teacher teaching and pupil? All these exist in the phenomenal plane though not in the noumenon Does the Adwaiti deny the efficacy of scripture or the grace and omnipotence of the Lord? Indeed he says ईश्वरानुग्रहादेव पुंसामद्वैतवासना

Only through the *Mahavakyopadesa* by God does Mukti come. Only he affirms that there is a luminous blessed counterpart of the state of deep sleep where all elements of diverseness are merged in *Sachchidananda* just as the followers of the other schools of thought affirm that there is a luminous blessed counterpart of the variegated diverseness of the world of our waking moments, in which death the vanquisher of bodies has no power over the realm of pure souls living in the radiance of the smile of the Eternal Lover and Beloved.

8 In fact many of the arguments and counter-arguments advanced on both sides have a basis of verbal difference and not a difference of thought. Sri Ramanuja asks, if the soul is the image and reflection of the Oversoul, would any one be so foolish to hold speech with his own image for the purpose of teaching? This is straining the conception of the image too far In the world of phenomena there are elements of likeness and elements of difference between God and the human soul The likeness is in the possession of चैतन्य. The unlikeness is in the infiniteness of love and wisdom in God's case and in the finiteness of love and wisdom in our case. In the case of the image of our body in a mirror, does either the body or the image

possess any चैतन्य (consciousness)? Does it follow that because no one will teach an image and no image can benefit by teaching, the Lord cannot teach the human soul and the human soul cannot be taught by Him?

देहिनोऽस्मिन्यथा देहे कौमारं यौवनं जरा ।
तथा देहान्तरप्राप्तिर्धीरस्तत्र न मुह्यति ॥ १३ ॥

As the soul has in this same body the states of childhood, youth, and old age even so it gets another embodiment. The wise have no illusions in this matter

NOTES.

1 This is a very important verse and hence this is the proper occasion for the consideration of the nature and excellences of the Indian doctrines of the immortality of the soul and of the reincarnation or transmigration of the soul Some religions teach transmigration but not immortality others teach immortality but not transmigration and yet others recognise and teach both but not the soul's *Sachidananda swarupa*, i e its nature as existence and knowledge and bliss. Our religion with its full unitive vision of truth has taught us all these three blessed truths.

2 Sri Sankaracharya says that this verse shows by reasoning the truth of the immortality of the soul as stated in the previous verse

3 देहिन. The word itself shows that the soul is the lord of the body and that the body is its object of ownership

4. The singular in देहिनः is explained by some Adwaitic commentators as showing that there is no plurality of souls just as the plurals used in the previous verse are explained by some Vishishtadwaitic commentators as showing the plurality of souls. Both the attempts are due to misplaced and misdirected zeal This is not the context dealing with the Oversoul and its relation with the soul That portion of the doctrine comes later Here the Lord combats Arjuna's initial and basic misconception in regard to the nature of the soul

5 Sri Madhusoodana points out that the Lokayatikas say that there is no soul apart from the body, that even in ordinary parlance we say, "I am stout" or "I am fair" indicating thereby that the soul and the body are not separate, that we talk of Devadatta's death and not the death of Devadatta's body, that hence doubts arise as to the separateness of the soul and the body and as to the certainty of the soul not dying with the body, and

that hence the Lord has given us the truth contained in this verse to dispel such doubts

6 The Lord has given in this verse one of the most telling proofs of the separateness of the soul from the body and of the certainty of its not dying with the body The body of a child the body of the same child as youth and the body of the same child as an old man appear to all as utterly separate and diverse Yet the man himself realises that he is the same and can never be convinced to the contrary despite what his images, or photographs, or portraits may show or what his friends and observers may say The three states (अवस्थात्रय) of childhood youth and old age are non simultaneous and contrary to one another (परस्परविरुद्ध). But the same personality feels 'I was the son of Devadatta. I am now the father of Yajnadatta.' If the sense of personality in the body of the child was a necessary result or effect or even concomitant of that state of childhood, there could not be this प्रत्यभिज्ञा or awareness of identity of personality That sense of personality would have made room for an utterly different sense of personality appropriate to the body of youth or to the body of old age There cannot be the link of memory if there is diverseness of

personalities, anymore than I can remember what you experience. Can you eat sugar and I revive the memory of its taste in me? Hence this telling illustration brings home to our minds with all the emphatic power of self-revelation the great truth of the separateness of the soul from the body, and its continuity and immortality as opposed to the disconnectedness and mortality of bodies A new body should not create doubts in our minds about the soul's immortality any more than the diverse bodies of childhood, youth, and old age can cause such a doubt in our minds

7 Let us now pursue the investigation of the nature of the soul further The Lord himself in the 22nd stanza gives us the telling illustration of the casting off of old clothes and the wearing of new and different garments to enable us to realise the truth of the immortality of the soul and its permanence amidst the diversity of impermanent bodies In the *Santi Parva* of the Mahabharata we have the equally forcible illustration of a man giving up one rented house and taking up another.

यथा हि पुरुष· शाला पुन. सम्प्रविशेन्नवाम् ।
एवं जीव· शरीराणि तानि तानि प्रपद्यते ॥
देहान्पुराणानुत्सृज्य नवान्सम्प्रतिपद्यते ॥

8 The unity of Self consciousness (प्रत्यभिज्ञा) being thus indisputable, the taking on of a fresh embodiment after death can cause no breach in its continuity any more than the occupation of a new house or wearing of a new cloth or the passing from childhood to youth and from youth to old age can cause such breach

9 There are some religions that declare the post-existence of the soul but not its pre-existence. If the line has thus a forward continuity despite the shadow of death what reason is there for denying its continuity backward, despite the shadow of birth? The line of consciousness that is revealed in this birth is that luminous portion between the shadow point of birth and the shadow point of death. Hence it is that Shakespeare declares that "our little life is rounded with a sleep If there is a waking beyond the sleep of death why was there not a waking beyond the sleep of birth? It is irrational to postulate the post-existence of the soul and deny its pre-existence

10 The interrogation of Death as the holder of the key of life was made for all time and for the benefit of the world for ever by Nachiketas and the *Kathopanishad* has given us the precious

answer Nachiketas pressed Yama for an answer and said.

> देवैरत्रापि विचिकित्सितं किल
> त्वं च मृत्यो यन्न सुविज्ञेयमात्थ ।
> वक्ता चास्य त्वादृगन्यो न लभ्यो
> नान्यो वरस्तुल्य एतस्य कश्चित् ॥

Yama replies नैषा तर्केण मतिरापनेया and then declares in golden words

> अशरीरं शरीरेष्वनवस्थेष्ववस्थितम् ।
> महान्तं विभुमात्मानं मत्वा धीरो न शोचति ॥

The nature of the soul and the means of the attainment of self-realisation are then declared by Yama in words that contain the quintessence of beauty and wisdom

11 What do we see in the world of nature? Insentiency Now a mere combination of insentient elements can never produce sentiency Hence the sentient soul cannot be a multiplicity but is a unity, cannot be an effect but is a cause The insentient cosmos is in a state of perpetual flux but the unitive sentient entity of soul is unchanging and eternal

12 I shall now deal with the other proofs of the immortality of the soul In the world of sen-

tency we have an infinite variety of aptitudes and endowments and powers If life is the gift of a new and special act of creation by God or if it is the accidental result of a fortuitous combination of atoms, why should not all men have similar powers of lives etc. ? He who in the unscientific language of the West which boasts itself on its scientific greatness is called a prodigy is merely one who has by intensity of effort attained great powers in other births and brings those *Vidyas* with him trailing clouds of glory as he comes. In the *Kumarasambhava* Canto I the greatest poet of India shows this in a beautiful verse.

> तां हंसमालाः शरदीव गङ्गां
> महौषधिं नक्तमिवात्मभासः ।
> स्थिरोपदेशामुपदेशकाले
> प्रपेदिरे प्राक्तनजन्मविद्याः ॥

13 Let us now take up the method of the analysis of our daily consciousness—the method is called the method of अन्वयव्यतिरेक (similarity and difference) Every day we pass through the three *avasthas* (states of consciousness) known as जाग्रत्, स्वप्न, and सुषुप्ति (the waking state the state of dream, and the state of deep sleep) Each is marked off from the next by a well marked line

of difference, and the realm of each excludes the realms of the others But disparate and disconnected as they are, there is a unifying principle of consciousness which by its inter-linkings of experience and memory connects them like an all-embracing sea connecting the disconnected islands of the ocean On waking up after deep sleep the sleeper says सुखमहमस्वाप्सं न किंचिद्वेदिषम् (I slept happily and I knew nothing then) Thus the ever-wakeful witness साक्षी is there watching the dance of life in the waking state, the reflex activity of the mind in the dreamful state, and the sheath of deep nescience that soothes and renews the tired elements of mind and body in the state of deep sleep Hence it is clear that there is a principle in man that is separate from the daily procession of the three states Life is a mere succession of days. Therefore if the soul is beyond the limitations of the day it is equally beyond the limitations of life and death In the famous पञ्चदशी Sri Vidyaranya says well.

शब्दस्पर्शादयो वेद्या वैचित्र्याज्जागरे पृथक् ।
ततो विभक्ता तत्संविदैकरूप्यान्न भिद्यते ॥

तथा स्वप्नेऽत्र वेद्यं तु न स्थिरं जागरे स्थिरम् ।
तद्भेदोऽतस्तयोः संविदेकरूपा न भिद्यते ॥

सुप्तोत्थितस्य सौषुप्ततमोबोधो भवेत्स्मृतिः ।
सा चावबुद्धविषयावबुद्धं तत्तदा तमः ॥
स बोधो विषयाद्भिन्नो न बोधात्स्वप्नबोधवत् ।
एवं स्थानत्रयेऽप्येका संवित्तद्वद्दिनान्तरे ॥
मासाब्दयुगकल्पेषु गतागम्येष्वनेकधा ।
नोदेति नास्तमेत्येका संविदेषा स्वयंप्रभा ॥

14 Again it is a part of the human experience that vague memories of past births cast their shadow or radiance athwart the present state of our being Keen observers who do not go through life as a mere place of business or of amusement have realised and recorded this fact again and again The most supremely beautiful statement of this fact is that which occurs in Kalidasa s world famous stanza in *Sakuntala*

रम्याणि वीक्ष्य मधुरांश्च निशम्य शब्दान्
पर्युत्सुको भवति यत्सुखितोऽपि जन्तुः ।
तच्चेतसा स्मरति नूनमबोधपूर्वं
भावस्थिराणि जननान्तरसौहृदानि ॥

I may mention here a few famous passages in English poetry bearing on this vital and precious truth

Wordsworth says.

"Our birth is but a sleep and a forgetting

The soul that rises with us, our life's star
Hath had elsewhere its setting
And cometh from afar,
Not in entire forgetfulness
Nor in utter nakedness
But trailing clouds of glory do we come"

Tennyson says in *In memoriam*

"The days have vanished, tone and tint,
And yet perhaps the boarding sense
Gives out at times, he knows not whence,
A little flash, a mystic hint"

In one of the most beautiful sonnets in the sonnet-sequence entitled *The House of Life* D G Rossetti says

"O born with me somewhere that men foget
And though in years of sight and sound unmet
Known for my soul's birth-partner well enough."

15 In the Brahma Sutras we have the 54th Sutra in Adhyaya III Pada III which has given us the last and final and perfect word on this topic.

व्यतिरेकस्तद्भावाभावित्वान्न तूपलब्धिवत् ।

Sri Sankaracharya has given us a very subtle and convincing piece of reasoning in his famous *bhashya* on this sutra If by reason of the fact that the faculties of the soul are visible only during the

existence of the body you say that they are only effects and resultant of physical causes then the same body remains even after death. The cause being there, the effect must be there even after death if your theory of cause and effect be true Form etc are physical qualities (स्वपरा) They are sensed equally well during life as well as after death. If the soul and its faculties be physical qualities like form etc why are they not realised as existant even after death? Further the purely physical qualities are capable of being sensed by others Is any one able to sense anothers's *chaitanya* or memory etc? Again as the *Atma Dharmas* are not realisible after death though they are realised during life we must conclude that they are not physical results but only temporary concomitants. Does the mere fact that they exist while the body exists justify us in concluding that they cannot exist when this body ceases to exist? No. They can attach themselves to another body Hence there is no justification for claiming for the opposite hypothesis the dignity of a proven truth. We may well ask those who assert that consciousness is only a resultant of the physical elements, how can consciousness be a quality of the elements which are the objects of consciousness? How can the subject be a resultant of the object? If conscious-

ness be a result of physical causes it cannot in the nature of things be aware of them How can anything act upon itself? स्वात्मनि क्रियाविरोधात् Fire cannot burn itself though it can burn other things. No circus performer can ever stand on his own shoulders It is impossible that the resultant of physical causes can be conscious of the causes or of their other physical effects Can one form be aware of another? Can one sound recognise other sounds? Can sugar be conscious of the sweetness of honey or even of its own sweetness? The existence of a subjective consciousness to which the material elements and their products are objects leads to the inevitable conclusion that they are utterly separate and divergent from it The two entities are as far apart as light and darkness. तमःप्रकाशवत् विरुद्धस्वभावयोः is the description that we have of them in the famous Adhyasa Bhashya of Sri Sankaracharya We realise that our self is consciousness. Hence it must be separate from the body It is permanent because its character and content are same and uniform नित्यत्वं चोपलब्ध्यैक्यात्. The consciousness that the same personality saw and felt in a particular way before demonstrates this clearly. The link of memory is possible only because of this identity of consciousness (प्रत्यभिज्ञा). The argument that utterly demol-

-thus the theory that consciousness is a physical product or resultant is thus stated by Sri Sankaracharya. We have consciousness in action when the body exists and when lamp etc. are existing For instance we see an object when we use our eyes and when there is a lamp to illumine the object Are we therefore to say that consciousness is an attribute of the body? We may with equal reason say that because perception takes place when there is a lamp and does not take place when there is no lamp it is an attribute of the lamp Co-existence is no ground for concluding in favour of a relation of cause and effect. As a matter of fact the co-operation of the body is not necessary for perception In a state of dream we have manifoldness of perception without the co-operation of the body Hence it is clear that the soul is separate from the body and is not a resultant or effect of physical causes and has a different origin life, and destiny from the body which is its physical sheath

18 The proofs of man's survival of bodily death as accumulated by psychic research societies are also acceptable in this connection though they throw no light on the real nature of the soul In the case of such proofs we must remember that

the mental body and in many cases also an invisible physical body exist, and the Western confusion of thought about this subtle physical sheath being the soul is an error to be avoided But they are of value as demolishing the ancient scientific superstition that there was and could be no entity separate from the physical body and surviving the destruction of the latter

17 If we may take the universal speech of humanity as embodying a universal concept of the human mind, we can well refer to such words as "This is my body," "My mind feels etc. as showing affirmations of the fundamental truth of the separateness of the soul

18 It is also pointed out that the yearning for an eternity of existence is itself a proof of the essential and inalienable immorality of the soul and of its true nature as eternal love and bliss. Sri Vidyaranya says in his famous Panchadasi

इयमात्मा परानन्दः परप्रेमास्पदं यत. ।
मा न भूव हि भूयासमिति प्रेमात्मनीक्ष्यते ॥

I may refer here also to Tennyson's famous lines in *The Two Voices* and in *In Memoriam*

"Who forged that other influence,

That heat of inward evidence
By which he doubts against the sense "
(*The Two Voices*)

A warmth within the breast would melt
The freezing reason's colder part
And like a man in wrath the heart
Stood up and answered I have felt.
(*In Memoriam*)

19 Again the revelation of the moral law in the heart as an eternal truth is of the very stuff of our being The eternal moral law would have no basis or validity or sanction unless the soul is immortal Tennyson says well about this

The wages of sin is death if the wages of virtue be dust
Would she have the heart to endure for the life of the worm and the fly ?
She desires no isles of the blest quiet seats of the just,
To rest in a golden grove or to bask in summer sky
Give her the wages of going on and not to die.

20 Again the soul comprehends the infinities of time, space and causation, and realises the joy of infinite love and renunciation and bliss. Only an

entity which is eternal can comprehend and realise such infinities.

21. I may mention also a few other valuable philosophical considerations The subject (ego) must learn its true nature only by introspective analysis and cannot learn it by any other analysis. As Hugo Munsterberg says in *The Eternal Life* ; "No science of the universe can say anything about ourselves who make the sciences . .To ask what time the real personality itself fills is not more reasonable than to ask whether the will is round or square, how many pounds it weighs, and what its colour may be ..... The real personality, the subject of will and thought, is not an object in time as it is itself the condition of time ...... From the highest point of view thousands of years may be grasped in one act" Mr Josiah Royce points out in his book on *The Conception of Immortality* that personality is purposive, that the fullfilment of purpose connot be in one life between birth and death, that personality transcends the sense, and that these facts prove the truth of the immortality of the soul In short what is infinite must be eternal and cannot begin in time as an act of creation, for what begins in time must end in time.

22. The doctrine of the immortality of the soul though not exactly in the form of the Hindu doctrine of reincarnation has been a universal belief at all times and amongst all races of men The ancient Hebrews Egyptians and Chaldeans held the belief but they thought that the soul was separate from the body but not independent of it and could not survive the death of the body, and hence the customs of burial and mummification came into existence. Among the Aryans it was always believed that the soul was entirely different from the body and had pre-existence and will have post-existence and hence arose the custom of cre mation

23 The doctrine of reincarnation alone can satisfactorily account for the inequalities of life and harmonise God s Justice and God's Mercy and give proper scope for the inevitable law of cause and effect in the realm of human action Also, the fear of death and the instinct for suckling which new born babies have can be explained only on that basis. The doctrine is the only rational theory that explains the facts of life as we realise them by experience

24 But after all the most convincing proof is the proof of intimate realisation as a fact of

consciousness in योगजप्रत्यक्ष (yogic vision). Again and again has our Scripture proclaimed this golden truth.

मात्रास्पर्शास्तु कौन्तेय शीतोष्णसुखदुःखदाः ।
आगमापायिनोऽनित्यास्तांस्तितिक्षस्व भारत ॥ १४ ॥

The contacts of the senses with outer world O son of Kunti, give us the sensations of pain and pleasure through cold and heat etc., but their nature is one of ceaseless flux and they are hence impermanent. Endure them with fortitude, O Bharata.

NOTES

1. This is an answer to Arjuna's implied question as to why even in the case of one who knows that the soul is beyond birth and death there is the feeling of the *Dvandvas* (qualities) of life like heat and cold, pain and pleasure, etc. The Lord replies that these are ever-changing and impermanent and will cease to overthrow our self-poised equilibrium when we bear them with fortitude.

2 The impermament and the permanent can never be really connected with each other. Hence the impermanent sense-contacts can never affect

the soul Nilakanta says tersely and well सत्यपि ध्यावस्तुनाधातात्म्यध्यासात् । The reason why the soul feels pain or pleasure is its illusion of identity with a particular condition of mind or body That is the reason why the pains and pleasures of the waking world are not carried into the dream world as they would be if they were of the stuff of our being

3 Madhusoodana says well that the doubt of Arjuna dispelled by this verse is as follows. Verse 13 showed that the soul is eternal But the soul must be different in each body because the pleasures and pains of men differ Each soul must have its own separate pains and pleasures though it is eternal. Hence the death of Bhishma and others will cause pain to me though I am eternal If this were not the case and each man s pleasures and pains were not peculiar to himself there would be confusion of joys and griefs (सुखदु खादिसंकर) The answer is that the contacts of the senses with the world give rise to sensations of heat and cold and pain and pleasure in the mind and that these sensations are not of the nature of the soul. Why so? Because the soul is eternal and the sensations are ephemeral There cannot be a relation of धर्मि (Dharmi) and धर्म (Dharma) among them because Dharmi and Dharma are one.

न हि नित्यस्यानित्यधर्माश्रयत्वं सम्भवति, धर्मधर्मिणोरभेदात्सम्बन्धान्तरानुपपत्तेः साक्ष्यस्य साक्षिधर्मत्वानुपपत्ते। Thus, the separateness of the soul and the sense-contacts is clear from the fact that the subject and the object cannot be identical साक्ष्यस्य साक्षिधर्मत्वानुपपत्तेश्च।

4 Sri Sankaracharya points out another aspect of variablity in sense-contacts besides their transcience Heat gives us pleasure in winter but pain in summer. The touch of ice gives pleasure in summer but pain in winter

5 Heat and cold are mentioned as typical and illustrative of all pains and pleasures classified as आध्यात्मिक, आधिभौतिक and आधिदैविक

6 Thus the more we realise our oneness with the Permanent and Eternal Self the less are we affected by the ephemeral flux of life and its ever-born and ever-dying pains and pleasures Hence Arjuna is told not to grieve for the pain caused by his apprehended separation from his kinsmen by the cruel hand of death in battle.

7 Thus the psychological analysis of sensuous pleasure and pain leads us straight to the truth of things. In sleep pain and pleasure disappear. The thing that causes pain or pleasure in the waking world disappears and makes soon for mind-

born pains and pleasures of the dreamland The beggar of the waking world may be an emperor in dreams The same object may give pain or plea sure Fire in our house or friend's house causes pain in a stranger s house indifference, and in an enemy s house pleasure. The sole cause is अभिमान (abhimana) by which the soul identifies itself with the mind which is the seat of pain and pleasure.

8 Sri Madhwacharya makes the verse yield a new richness of meaning by taking the first half of the stanza to have a note of interrogation Do the sense-contacts alone cause pain or pleasure ? No They are impermanent. *Abhimana* is the important cause It can be given up while sense contacts cannot be.

9 Some commentators interpret मात्रा as meaning the senses Others interpret it as sound etc The main idea is the same in any view

यं हि न व्यथयन्त्येते पुरुषं पुरुषर्षभ ।
समदुःखसुखं धीरं सोऽमृतत्वाय कल्पते ॥ १५ ॥

O high souled among men! the man of wisdom whom these (contacts of the senses with the outer world do not affect and to whom pain and pleasure are equal and alike is fit for the attainment of liberation (Moksha).

NOTES:

1 He is unaffected because of his realisation of the Eternal Self (नित्यात्मदर्शनात् as Sri Sankaracharya says)

2. Nilakanta says thet these sense-contacts should not affect a man during the waking state or the dreamful state or असंप्रज्ञातसमाधि.

3 पुरुष The term is used to show that the soul is only a sojourner in the body पूर्षु अष्टासु वसतीति पुरुष: (He who dwells in the 8 towns)

4. धीरं is interpreted as धीमन्तं, or ध्यायिन, or योगिन, or धिय ईरयन्तं (The man of wisdom or of devotion, or of concentration, or he who controls and directs his mind)

5 If bondage were natural to the soul, it will never go unless the soul is destroyed. But it is foreign to the soul and can be removed. The illuminer and the illumined can never be one and the same

6 This sameness and equableness can be attained not by flying away from pain and pleasure but by self-discipline which enables us to achieve balance of nature.

7 Sri Ramanuja says that he who does his allotted duty in a spirit of detachment will not be affected by the sense-contacts

नासतो विद्यते भावो नाभावो विद्यते सतः ।
उभयोरपि दृष्टोऽन्तस्त्वनयोस्तत्त्वदर्शिभिः ॥ १६ ॥

The unreal and transient hath no being. The real and eternal never ceases to be. They who have attained the faculty of seeing the truth of things know the real nature of both

NOTES

1 The sense-contacts are unreal and fleeting The soul is real and eternal. In the case of every thing we see on analysis that the attribute of existence is common to all though the other transient attributes vary Without the basis of the permanent and eternal the elements of fleeting change cannot exist at all

2 The पदार्थ exist always—even in deep sleep because the soul realises सुख (pleasure) and अज्ञान (nescience) then and remembers these on waking up

3. What is unreal? Whatever has परिच्छेद (limitation) परिच्छेद is of 3 kinds—कालपरिच्छेद देशपरिच्छेद, वस्तुपरिच्छेद (limitation in time, limitation in

space, and limitation by other limited things, (वस्तु परिच्छेद is of 3 kinds—सजातीयभेद, विजातीयभेद, and स्वगतभेद (differentiation from like objects, differentiation from unlike objects, and internal differentiation) Some say that it is of 5 kinds जीवेश्वरभेद, जीवजगद्भेदः जीवपरस्परभेदः, ईश्वरजगद्भेद, जगत्परस्परभेदः It has well been said आदावन्ते च यन्नास्ति वर्तमानेऽपि तत्तथा ।

4 तत्त्वदर्शिभि वस्तुयाथात्म्यादर्शनशीलैः ब्रह्मविद्भि (those who are *habituated* by discipline and meditation to know and realise the truth and real nature of things) The Sruti says वाचारम्भणं विकारो नामधेय मृत्तिकेत्येव सत्यम् ।

5 Sri Ramanujacharya says that असत् means the body and सत् means the soul

6 Sri Madhwacharya says that असत् means Prakriti and that सत् means God and that the verse says that both are real The verse is thus split up न सतः विद्यते अभाव न अभावः विद्यते सतः Another meaning given by him is that असत् means sin and सत् means right and that the verse means from wrong no good can result and that from right no evil can result In this sense the verse would be an answer to Arjuna's statement पापमेवाश्रयेदस्मान् हत्वैतानाततायिनः । Both the meanings are very interesting but they do

not relate directly to the context The verse is an explanation of the previous verse which says शोऽस्य त्वाम् कस्मते and the verse previous to it which says तितिक्षस्व भारत The soul is eternal The cause of शोक मोह (grief and illusion lies really in the भीमयम (the world of mind) The news of a son having been born in a man's absence causes pleasure though the birth was long before then. The death of a relation causes pain only on its being communicated to us. The same thing that once caused pain now causes pleasure. As Kalidasa says in Vikramorvasiya the very objects which caused pain in the absence of the beloved cause pleasure in his presence (यावास एव शशिन मुखयन्ति गात्र पापास्त एव मदनस्य मनोऽनुकूलाः । संगमहानिमिव सुन्दरि यददासीत्वदयनेन वासिदिवानुनी सम् ॥) If by steady discipline, concentration meditation devotion and introspection we realise the Eternal we would not be agitated by the sense-contacts but would attain Eternal Bliss

अविनाशि तु तद्विद्धि येन सर्वमिदं ततम् ।
विनाशमव्ययस्यास्य न कश्चित्कर्तुमर्हति ॥ १० ॥

Know that to be indestructible by which all this universe is pervaded There is none that has the power of effecting the destruction of the Imperishable One

NOTES

1. It pervades all, as ether, is all-pervasive. It pervades and sustains even ether (akasa). It illuminates everything and is both immanent and transcendent. अजायमानो बहुधाभिजायते । तस्य भासा सर्वमिदं विभाति ।

2 विनाश is देशकालवस्तुपरिच्छेद Destruction is limitation But Atma is Sachchidananda and is Aparichchinna (unconditioned)

3 What is all-pervasive cannot be limited or destroyed for there is no other power to limit or destroy it स्वात्मनि क्रियाविरोधात् as Sri Sankaracharya says.

4 Limitation may be destruction (अनित्यत्व), or loss of body (देहहानि), or liability to grief (दुःखप्राप्ति), or imperfection (अपूर्णता) God is beyond all these He is all-pervasive, eternal, and perfect

5. We must not confuse this pervasion by God with the attempt of scientists like Sir J. C. Bose to prove the aliveness of the so-called "dead" matter These deal with the pervasion by *energy* which resides in and displays itself as much in "inanimate matter" as in animate bodies.

6. Sri Ramanujacharya says that the verse

refers to jivas (individual souls) and that they are collectively everywhere

> अन्तवन्त इमे देहा नित्यस्योक्ताः शरीरिणः ।
> अनाशिनोऽप्रमेयस्य तस्माद्युध्यस्व भारत ॥ १८ ॥

These perishable bodies have been declared to be in relation to the Eternal Embodied One who is indestructible and inconceivable Therefore fight, O Bharata

NOTES

1 देहाः—The plural is used as we have sthula sukshma and karana sariras Nitya and Anasi are both used—because in respect of worldly objects we see disappearance or change and the Lord wants to negative both in regard to the soul

2 अप्रमेय—It may be asked is not Atma disclosed by the Veda as प्रमाण, though not by प्रत्यक्ष or अनुमान ? No Atma is स्वतःसिद्ध (self revealed) Sastra merely removes wrong notions imposed by nescience. Sri Sankaracharya says शास्त्रं त्वन्त्यं प्रमाणं अतद्धर्माध्यारोपणमात्रनिवर्तकत्वेन प्रमाणत्वमात्मनि प्रतिपद्यते न तु अज्ञातार्थज्ञापकत्वेन । Atma is प्रमाता and प्रकाश—as Sri Ramanuja says

3 It has been well said

B G 10

प्रमाणमप्रमाणं च प्रमाभासस्तथैव च ।
यत्प्रसादात्प्रसिद्ध्यन्ति तदसभावना इत ॥

4. युद्धयस्व Sri Sankara shows that this is not a positive injunction. It means, do not desist from your duty of war. Arjuna had come to fight but was overcome by soka (grief) and moha (illusion) The Lord removes the hindrance to his doing of his duty The seeming command is hence an अनुवाद, not a विधि Each man must do his duty and rise through it to devotion and wisdom and attain self-realisation अपवादापवादे उत्सर्गस्य स्थिति (if the exception is overthrown the rule remains) Sri Ramanuja says अमृतत्वप्राप्तये अनभिसंहितयुक्तं युद्धाख्यं कर्मारभस्व ।

5 Sri Madhwacharya says that the verse means that the souls are God's bodies *i e*, God's images in the spiritual body This view is no doubt beautiful but the context shows that the Lord is now dealing with the utter separateness of Atma and Anatma and is not here dealing with the complexities of thought about the inter-relations of the Soul and the Oversoul

6 Each of the 6 words—इमे, देहाः, नित्यस्य, शरीरिणः, अनाशिनः, and अप्रमेयस्य—emphasises an aspect of difference between soul and body देहा कर्मफलभोगार्थतया भूतसघातरूपः (material combinations to enable

the soul to reap the fruits of actions) as Sri Ramanuja says

> य एनं वेत्ति हन्तारं यश्चैनं मन्यते हतम् ।
> उभौ तौ न विजानीतो नायं हन्ति न हन्यते ॥ १२ ॥

He who regards the soul as slayer and he who regards the soul as slain—both are ignorant He slayeth not nor is he slain

NOTES

1 This and the next verse are taken from the Katha Upanishad by the Lord as authoritative declarations

2 The verse shows that the soul is neither कर्ता nor कर्म It disproves the Tarkika (logicians) theory of the soul s being a *karta* and the Charvaka (agnostic) theory of the soul ceasing to exist at the time of the death of the body

3 Well is it said

> आत्मा कर्तादिरूपश्चेन्मा काङ्क्षीस्तर्हि मुक्ताम् ।
> न हि स्वभावो भावानां व्यावर्तेतौष्ण्यवद्रवेः ॥

This means that if the soul is a doer by nature that quality will never disappear being like the heat of the sun and hence there would be no use in praying for मुक्ति It has also been said

नर्ते स्याद्विक्रिया दुःखी साक्षिता का विकारिणः ।
धीविक्रिया सहस्राणां साक्ष्यतोऽहमविक्रियः ॥

The soul is the witness Eternal, Immutable, Perfect

न जायते म्रियते वा कदाचि-
न्नायं भूत्वा भविता वा न भूयः ।
अजो नित्यः शाश्वतोऽयं पुराणो
न हन्यते हन्यमाने शरीरे ॥ २० ॥

He is never born, nor doth He ever die. Nor does He, having been born, cease to be. He is unborn, immortal, eternal, ever new though ever-old. He is not slain even though the body be slain

NOTES

1 This stanza also is taken from Katha Upanishad

2 It negatives in regard to the soul the modifications inherent in matter, existence, birth, growth, transformation, decay, and death 'जायतेऽस्ति वर्धते विपरिणमतेऽपक्षीयते विनश्यति' इति षड्भावविकाराः ।

3 भूत्वा भविता न भूयः is used to negative the क्षणिकविज्ञानवाद of Buddhists The self is not a series

of momentary realisations or sensations but is a changeless and eternal truth The fact of self consciousness that 'I am the grandson of so and so and am the same man today as then and am the grandfather of so and so' is clear proof of this.

4 पुराण:—It shows that the soul is older than even the akasa (ether)—the oldest of creations पुराऽपि नव एकम्

5 Here न जायते म्रियते is the प्रतिज्ञा (i.e.) the proposition or fact to be proved कदाचिन्नायं भूत्वा भविता न भूयः contains the reasoning अजो नित्यः represents the conclusion

वेदाविनाशिनं नित्यं य एनमजमव्ययम् ।
कथं स पुरुषः पार्थ कं घातयति हन्ति कम् ॥ २१ ॥

He who knoweth him to be indestructible, eternal, without birth, and immutable—whom can such a person cause to be slain or whom can he slay ?

NOTES

1 वेद—The knowing here referred to is 'realisation and not mere intellectual comprehension It means शास्त्राचार्योपदेशाभ्यां साक्षात्करोति as Sri Madhusoodana says

2 The Veda says

आत्मानं चेद्विजानीयादयमस्मीति पूरुषः ।
किमिच्छन्कस्य कामाय शरीरमनुसञ्ज्वरेत् ॥

3 Sri Sankaracharya says that this verse shows that the self is really a witness and not a doer and that liberation is through jnana

4 Sri Madhwa says that the verse negatives not action but action independent of God

वासांसि जीर्णानि यथा विहाय
नवानि गृह्णाति नरोऽपराणि ।
तथा शरीराणि विहाय जीर्णा-
न्यन्यानि संयाति नवानि देही ॥ २२ ॥

As a man, casting off worn-out garments, wears new and different garments, so the soul casting-off worn-out bodies, enters new and different bodies

NOTES

1 This verse shows that the new bodies may be similar to or different from, the old body, as in the case of new cloths The words नवानि and अपराणि are both used in the verse This shows that there is no guarantee that a soul' with a human embodiment is sure to have human embodiments alone hereafter.

2 As clothes grow old despite all care so bodies will grow old and die despite all medical help

3 The Mahabharata gives in the Santi Parva another telling illustration—that of tenant leaving an old house and occupying a new house

यथा हि पुरुष शालां पुनः सम्प्रविशेन्नवाम् ।
एव जीव शरीराणि तानि तानि प्रपद्यत ।
देहान् पुराणानुत्सृज्य नवान्सम्प्रतिपद्यते ॥

4 The Gita shows in Chapter VIII verse 6 the importance of the अन्तिमस्मृति (or the last thought) in regard to the future embodiment and this again depends upon the regulated and disci plined life

5 जीव—does not negative the dying of infant bodies It shows that bodies that have fulfilled their purposes are cast away whether they are young or old

6 Thus there is a law of evolution governing spiritual life as there is a law of evolution govern ing physical life

7 Death is only the gate of life or rather death is reborn as life The death of the seed is the life of the tree

नैनं छिन्दन्ति शस्त्राणि नैनं दहति पावकः ।
न चैनं क्लेदयन्त्यापो न शोषयति मारुतः ॥ २३ ॥

Weapons cannot cleave him; nor can fire burn him Water cannot wet him, nor can air dry him away.

NOTES

1. The Scripture describes the soul as अशब्दमस्पर्शमरूपमव्ययं तथाऽरसं नित्यमगन्धवच्च यत्. The soul is without देशकालवस्तुपरिच्छेद

2 The main idea is that the soul is immaterial and eternal and cannot be affected by the forces of the material universe A body may be burnt when the house where it is is burnt But the soul within the house of the body is not burnt when the body is burnt

अच्छेद्योऽयमदाह्योऽयमक्लेद्योऽशोष्य एव च ।
नित्यः सर्वगतः स्थाणुरचलोऽयं सनातनः ॥ २४ ॥

He cannot be cut to pieces, he cannot be burnt, neither can he be wetted by water nor dried by air, he is eternal, all-pervasive, firm immovable, and beginningless

NOTES

1. Sri Sankaracharya says that the Lord is

repeating what has been already stated because the matter is difficult of comprehension

2 Matter in its fundamental form is indestructible but it changes form perpetually The soul is unchanging and indestructible. It is *sachchidananda* whether one with *Paramatman* as the Advaitins say or in eternal relation with him as the Visishtadvaitins say

અવ્યક્તોઽયમચિન્ત્યોઽયમવિકાર્યોઽયમુચ્યતે ।
તસ્માદેવં વિદિત્વૈનં નાનુશોચિતુમર્હસિ ॥ ૨૫ ॥

He is not realisable by the senses; he is not realisable by the mind he is immutable; therefore knowing him to be such, you should not grieve in regard to him

NOTES

1. As the soul has no material form the senses and the mind cannot grasp it विकार means change of form—सूक्ष्म स्थूल etc.

2 If the mind becomes pure and steadfast, the full glory of the soul is reflected in it. दृश्यते त्वग्र्यया बुद्ध्या सूक्ष्मया सूक्ष्मदर्शिभिः —

अथ चैनं नित्यजातं नित्यं वा मन्यसे मृतम् ।
तथापि त्वं महाबाहो नैवं शोचितुमर्हसि ॥ २६ ॥

Even if you regard him as constantly born and constantly dying, even then, O mighty-armed, you should not grieve.

NOTES

1 The Lord merely adds here an argument on the assumption of the ordinary view being right अथ shows that there is a change of topic

2 The prevalent ordinary views are the Buddhist view that the soul is born and dies every moment, the Charvaka view which identifies body and soul, the Tarkika view that the soul is eternal but is born with the *body and dies with it*, the view that the soul is born with the body and dies with it though both are separate, the view that the soul endures from Kalpa to Kalpa and then dies, etc etc etc The Lord says that even according to these views grief is absurd, because what is the use of grieving for the inevitables? Arjuna was afraid of sin and its future consequences In the light of the above views there could be no future consequences In the light of the really correct view the soul is eternal and pure

जातस्य हि ध्रुवो मृत्युर्ध्रुवं जन्म मृतस्य च ।
तस्मादपरिहार्येऽर्थे न त्वं शोचितुमर्हसि ॥ २७ ॥

Certain is death to the born and certain is

birth to the dead Therefore you should not grieve for what is irremediable

NOTES

1 This verse merely carries forward the idea of the previous verse If the soul is born with the body and dies with the body and is then reborn with the body this cycle will go on whether you will or not Why then grieve for the inevitable?

अव्यक्तादीनि भूतानि व्यक्तमध्यानि भारत ।
अव्यक्तनिधनान्येव तत्र का परिदेवना ॥ २८ ॥

All the beings have an unknown beginning, a known middle, and an unknown ending What ground is there for lamentation?

NOTES

1 It is well said अदर्शनादापतितः पुनश्चादर्शनं गतः He came from non existence and has gone back there That is what the spectacle of life shows to one who gazes on its outside If we accept this, the Lord says that there is no ground for grief These verses do not deal with the real nature of the soul for that has been stated already The Lord says that even if we take the erroneous views of those who do not know the inner truth of things the attitude of grief is unreasonable and improper

From the next verse the interrupted exposition of the real truth is resumed and completed after a few other special appeals to Arjuna's chivalry and valour.

आश्चर्यवत्पश्यति कश्चिदेन-
मारचयेवद्वदति तथैव चान्यः ।
आरचर्यवच्चैनमन्यः शृणोति
श्रुत्वाप्येनं वेद न चैव कश्चित् ॥ २९ ॥

One regards the soul as a marvel. Another speaks of the soul as a marvel A third hears of him as a marvel Even after hearing about him no one realises him

NOTES

1 This verse is meant to show the difficulty of realising the true nature of the soul It suggests also that those who know and speak and hear about the Self are rare and remarkable men The Sruthi says

आश्चर्यो वक्ता कुशलोऽस्य लब्धा आश्चर्यो ज्ञाता कुशलानुशिष्टः ।

2 To vision Him, to voice Him, and to hear about Him are all wonderful for He is beyond mind and speech

3 The verse may mean also that He is realised, taught, and heard as a marvel

4 Sri Ramanujacharya points out that the context shows that the Lord is referring here to the soul (jiva) and not to God The soul is differ ent from all material objects and is hence a real marvel because a marvel is what is unlike all other things

5 Nilakanta takes एन to relate to the cos mos and says that the verse impresses upon us the inscrutable character of the world of being

6 The soul can be realised in *yoga* It is योगगम्य It is called wonderful because the realisations of the transcendental and supernormal consciousness appear so to the ordinary conscious ness The Katha Upanishad says

पराञ्चि खानि व्यतृणत्स्वयम्भूस्तस्मात्पराङ्पश्यति नान्तरात्मन् ।
कश्चिद्धीरः प्रत्यगात्मानमैक्षदावृत्तचक्षुरमृतत्वमिच्छन् ॥

7 We realise the supreme in deep sleep yet we do not know it. Many speak learnedly about Him and many hear about Him Yet very few know and *realise* Him Only those whose mind becomes pure and free from sin can realise Him As Sri Ramanujacharya finely says महता तपसा क्षीण पाप उपचितपुण्य कश्चित्पश्यति । It is said also श्रवणायापि बहुभिर्यो न लभ्यः ।

8. Thus the view that this verse describes the Oversoul and the view that it describes the cosmos have elements of truth, but the most appropriate meaning in the light of the context is that it describes the soul as it is, beyond and behind the body, the senses, and the mind The soul is separate from the स्थूल, सूक्ष्म, and कारण bodies

देही नित्यमवध्योऽयं देहे सर्वस्य भारत।
तस्मात्सर्वाणि भूतानि न त्वं शोचितुमर्हसि ॥ ३० ॥

The soul though dwelling in the bodies of all is invulnerable and immortal, O Bharata Therefore thou shouldst not grieve for any embodied being

NOTES

1 The Lord here returns to His own point of view and concludes the present प्रकरण (theme)

2 Death is not annihilation, it is no loss of ultimate and essential reality; it does not affect the real destiny of the soul Where, then, is there any occasion for grief?

3 As regards this verse also, some take it as refering to God and others as referring to the soul As stated by me already the context shows that it refers to the soul though the Lord could

certainly have implied also the real and essential divinity of the soul The Advaitins hold the soul and the oversoul to be one The Visishtadvaitins hold them to be separate and yet one because the Lord has the cosmos and the jivas as his universal body According to them the souls are atomic and similar though the bodies differ from *devahood* downwards. The Dvaitins hold also that the souls differ in quality and capacity Whether the ultimate truth is universal unity or universal equality or universal variety all are agreed that the soul is *sacchidananda* in its essential nature

स्वधर्ममपि चावेक्ष्य न विकम्पितुमर्हसि ।
धर्म्याद्धि युद्धाच्छ्रेयोऽन्यत्क्षत्रियस्य न विद्यते ॥

Looking at your own Dharma also, you ought not to falter For there is no higher good and auspiciousness to a Kshatriya than a war which does not swerve from Dharma

NOTES

1 The Lord means that Arjuna as a Kshatriya prince should regard war as natural to him The Lord is going to show this in Chapter XVIII verse 43 Also a righteous war is to protect men and establish Dharma through the means of victory and conquest This is in answer to Arjuna s state

ment in Chapter I, that he will go to hell if he kills men in battle नरके नियतं वासो भवति । न च श्रेयोऽनुपश्यामि हत्वा स्वजनमाहवे । The Lord shows where true श्रेयस् is for a Kshatriya

2 The duty of a Kshatriya to be the armed and victorious protector of Dharma is thus stated by Parasara

> क्षत्रियो हि प्रजा रक्षञ्शस्त्रपाणिः प्रदण्डवान् ।
> निर्जित्य परसैन्यानि क्षितिं धर्मेण पालयेत् ॥

Manu says

> समोत्तमाधमै राजा चाहूतः पालयन् प्रजाः ।
> न निवर्तेत संग्रामात् क्षात्रं धर्ममनुस्मरन् ॥
>
> संग्रामेष्वनिवर्तित्वं प्रजानां चैव पालनम् ।
> शुश्रूषा ब्राह्मणानां च राज्ञः श्रेयस्करं परम् ॥

3 The Sanskrit word Dharma is untranslatable in English It imports the idea of prenatal tendencies, the idea of morality, the idea of scriptural injunction, etc It means even God Hence doing duty in the proper spirit is an act of worship of God

4. In Wordsworth's *Happy Warrior* we have a fine description of the man who rejoices in a righteous war and does his work in life in a spirit of joyful elation at his being called to it

'Whose high endeavours are an inward light
That makes the path before him always bright.'

5 A righteous war causes no ill to the fighter or the slain as the killing of animals in sacrifice causes no ill to the sacrificer or the sacrificial animal but benefits both. This meaning is specially emphasised by Sri Ramanuja.

6 The Lord is pleased by His commands to each man being carried out by the latter and not by the latter doing another act even if it be higher just as a King is pleased by obedience and not by a disobedient doing of a better action.

यदृच्छया चोपपन्नं स्वर्गद्वारमपावृतम् ।
सुखिनः क्षत्रियाः पार्थ लभन्ते युद्धमीदृशम् ॥ ३२ ॥

O Partha ! Blessed are the Kshatriyas who are called to such a war as this where the gate of heaven is flung open without any seeking for it.

NOTES

1 यदृच्छया means also what is got by divine agency and grace

2. Madhusoodana points out that it may be argued that Dharma Sastra says that you should not kill (न हिंस्यात्सर्वभूतानि) while Artha Sastra pres

cribes war for Kshatriyas, and that the Dharma Sastra is higher than Artha Sastra and must be followed.

स्मृत्योर्विरोधे न्यायस्तु बलवान्व्यवहारतः ।
अर्थशास्त्रात्तु बलवद्धर्मशास्त्रमिति स्थितिः ॥

The Lord shows that the fighting of a righteous war by a Kshatriya is a duty cast upon him by Dharma Sastra and that if a warrior fights in a righteous cause and as a Karma Yogin he attains heaven. As righteous war is enjoined, the text of prohibition has no application विधिस्पृष्टे निषेधानवकाशः ।

3 This verse is an answer to Arjuna's question in Chapter I. स्वजनं हि कथ हत्वा सुखिनः स्याम माधव ।

4. सुखिनः सुखं पुण्यं (merit). Sri Desikar thinks that it means antecedent पुण्य The Lord refers to such antecedent पुण्य and also to the prospective पुण्य. It is said that warriors attain Heaven.

ये युध्यन्ते प्रधनेषु शूरासो ये तनुत्यजः ।
ये वा सहस्रदक्षिणास्तांश्चिदेवापि गच्छताम् ॥
आहवेषु मिथोऽन्योन्यं जिघांसन्तो महीक्षित. ।
युध्यमानाः परं शक्त्या स्वर्गं यान्त्यपराङ्मुखा. ॥

अथ चेत्त्वमिमं धर्म्यं संग्रामं न करिष्यसि ।
ततः स्वधर्मं कीर्तिं च हित्वा पापमवाप्स्यसि ॥

But if thou wilt not fight in this just war, thou wilt be thereby casting away thy svadharma (your own dharma) and forfeiting thy honour, and thou wilt also incur sin

NOTES

1 Manu describes Dharma Yuddha thus in verses full of true nobility of feeling and chivalry of nature :

न कूटैरायुधैर्हन्याद्युध्यमानो रणे रिपून् ।
न कर्णिभिर्नापि दिग्धैर्नाग्निज्वलिततेजनैः ॥

न च हन्यात्स्थलारूढं न क्लीबं न कृताञ्जलिम् ।
न मुक्तकेशं नासीनं न तवास्मीति वादिनम् ॥

न सुप्तं न विसंनाहं न नग्नं न निरायुधम् ।
नायुध्यमानं पश्यन्तं न परेण समागतम् ।

नायुधव्यसनप्राप्तं नार्तं नातिपरिक्षतम् ॥
न भीतं न परावृत्तं सतां धर्ममनुस्मरन् ॥

2. Hence Arjuna should perform only Dharma Yuddha and just as it was his duty to do so it was also his nature to do so No sin or evil consequences can attach to doing one's duty The injunctions say

निर्जित्य परसैन्यानि क्षितिं धर्मेण पालयेत् ।
न निवर्तेत संग्रामात् ।

3. Only the nation that fights for its rights in just wars can preserve immortal vitality. That one will not live which one is not *prepared* to die for. The fund of altruism in the community determines the longevity of its vital racial life

4 The Lord points out also that if Arjuna fled from the field, he would be killed by his unscrupulous enemies, and further his previous merit (पुण्य) will go to the King whom he betrays and the King's sins (पाप) will go to him Manu says ·

यस्तु भीतः परावृत्तः संग्रामे हन्यते परैः ।
भर्तुर्यद्दुष्कृतं किंचित्तत्सर्वं प्रतिपद्यते ॥
यच्चास्य सुकृतं किंचिदमुत्रार्थमुपार्जितम् ।
भर्ता तत्सर्वमादत्ते परावृत्तहतस्य तु ॥

Yajnavalkya says .

राजा सुकृतमादत्ते हतानां विपलायिनाम् ।

5. This verse is the Lord's reply to Arjuna's statements in Chapter I

पापमेवाश्रयेदस्मान्हत्वैतानाततायिनः ।
एतान्न हन्तुमिच्छामि घ्नतोऽपि मधुसूदन ॥

6 Hence it is in the performance of duty that everything lies. As Pope says

"Honour and shame from no conditions rise,
Act well your part there all honour lies."

The story of Dharma Vyadha shows this very well. કીર્તિ means honour and renown resulting from the doing of *svadharma* in an exalted spirit of Nishkama and Isvararpana

> અકીર્તિં ચાપિ ભૂતાનિ કથયિષ્યન્તિ તેઽવ્યયામ્ ।
> સંભાવિતસ્ય ચાકીર્તિર્મરણાદતિરિચ્યતે ॥ ૩૪ ॥

The world will always recount thy eternal disgrace. To one who is highly honoured dishonour is worse than death

NOTES

1. By the word ભૂતાનિ not only men but also gods sages, and others

2. અવ્યયાં —means for a very long time

3 The second half of the verse answers the question Is not life with dishonour better than death ?

4. As Shakespeare says in Othello

> " Good name, in man and woman dear my Lord
> Is the immediate jewel of their souls.
> Who steals my purse steals trash It is something nothing,
> It was mine, t is his and has been slave to thousands

But he that filches from me my good name,
Robs me of that which not enriches him
But makes me poor indeed "

भयाद्रणादुपरतं मंस्यन्ते त्वां महारथाः ।
येषां च त्वं बहुमतो भूत्वा यास्यसि लाघवम् ॥३५॥

The Maharathas will think that thou hast withdrawn from the battle through fear. Thou wilt be lightly thought of by those who highly thought of thee.

NOTES

1. I have already described Maharathas and Atirathas The Lord says that foemen worthy of his steel will think lightly of his valour.

2. This estimation of equals is the truest spur to noble action The Hindu benediction is समानामुत्तमश्लोको भवतु (Be esteemed among thy equals).

3 *Akirti* (dishonour) is distant disreptue लघु-कृति· thinking lightly is a near disgrace This is clearly pointed out by Sankarananda

अवाच्यवादांश्च बहून्वदिष्यन्ति तवाहिताः ।
निन्दन्तस्तव सामर्थ्यं ततो दुःखतरं नु किम् ॥

Thine enemies will speak about thee many unspeakable slanders, cavilling at thy prowess What is more painful than that?

NOTES

1 While honourable warriors will *think* lightly of you as stated in verse 35, enemies will be joyfully articulate in slandering you. They will attribute also false acts of shame to you, seeing an opportunity for slander

हतो वा प्राप्स्यसि स्वर्गं जित्वा वा भोक्ष्यसे महीम्।
तस्मादुत्तिष्ठ कौन्तेय युद्धाय कृतनिश्चयः ॥ ३७ ॥

Dying thou attainest heaven conquering thou enjoyest the earth Therefore, O Son of Kunti, arise, resolved to fight

NOTES

1 This is in answer to Arjuna s statement:

न चैतद्विद्मः कतरन्नो गरीयो यद्वा जयेम यदि वा नो जयेयुः ।

2. The victor attains earthly sovereignty and *svarga* afterwards The slain attains *svarga* at once.

3. The attempt of some commentators to make *svarga* mean *moksha* is not acceptable. Such doing of duty is a *Moksha sadhana* (a means of reaching Moksha in due course) while it is also the door to heaven

4. निश्चय means a religious conviction.

सुखदुःखे समे कृत्वा लाभालाभौ जयाजयौ
ततो युद्धाय युज्यस्व नैवं पापमवाप्स्यसि ॥ ३८ ॥

Viewing with composure and treating alike pleasure and pain, gain and loss, victory and defeat, get ready for battle Then shalt thou not incur sin.

NOTES

1. The Lord teaches that Nishkama karma leads to liberation and God-realisation The appeal to the lower reasons for doing duty is over. Here the Lord appeals to the highest reason that it is the only means of God-realisation through purification of mind and attainment of wisdom and devotion फलेच्छां तु परित्यज्य कृतं कर्म विशुद्धिकृत् ।

2 The minor results stated already are accidental and accessory, just as in the case of one planting a mango tope for fruits, shade and fragrance also come to him unsought for. Even if these do not come, Dharma remains by his side to uplift him As Apastamba says तद्यथाम्रे फलार्थे निर्मिते छायागन्ध इत्यनूत्पद्येत एवं धर्मं चर्यमाणमर्था अनूत्पद्यन्ते नो चेदनूत्पद्यन्ते न धर्महानिर्भवति ।

एषा तेऽभिहिता सांख्ये बुद्धिर्योगे त्विमां शृणु ।
बुद्ध्या युक्तो यया पार्थ कर्मबन्धं प्रहास्यसि ॥ ३९ ॥

This has been declared to you the knowledge in respect of the realisation of the Eternal Truth Now hear the knowledge of the means of such realisation—by means of the attainment of which knowledge you shall be freed from the bondage in the form of karma (action)

NOTES

1. The Lord after various appeals to Arjuna pointing out the unwisdom of his resolve returns to and concludes the portion of the discourse which gave him the deepest truths of life i e *Jnana yoga* Henceforth the Lord leads from Jnanayoga to the means i e , Karma yoga which is going to be the main theme up to the end of the VIth Adhyaya

2. The view of some persons that the words Samkhya and Yoga here refer to the systems of philosophy going by that name is wrong and is against our traditional interpretation

3 Karma yoga purifies the mind and fits us for Bhakti and Jnana through the grace of god. It removes karmabandha i e , the embodiments of *samsara* due to the actions born of motive and

impelled by desire If therefore we do our *dharma* unattached and dedicating its fruits to the Lord, *karma* has no power of generating bondage. The Isavasyopanishad says

> ईशावास्यमिदं सर्वं यत्किंच जगत्यां जगत् ।
> तेन त्यक्तेन भुञ्जीथा॰ मा गृधः कस्य स्विद्धनम् ॥
>
> कुर्वन्नेवेह कर्माणि जिजीविषेच्छतं समाः ।
> एवं त्वयि नान्यथेतोऽस्ति न कर्म लिप्यते नरे ॥

4. This does not mean that *Jnana yoga* will not remove *karma bandha* The Lord says in the Gita ज्ञानाग्निः सर्वकर्माणि भस्मसात्कुरुतेऽर्जुन । The Sruti says: तपसैवात्मपदं विदित्वा न लिप्यते कर्मणा पापकेन । But the impure mind immersed in worldliness cannot at once rise to this height. Nishkama Karma yoga will effectively and easily purify it धर्मेण पापमपनुदति । I am quite unable to understand the angry attitude of some modern commentators in regard to Madhusoodana's beautiful exposition on this point.

5. The Lord does not mean any reflection on Arjuna as being unfit for jnana yoga Many persons seem to forget in this connection that the Lord gave the complete Sastra to the world making the teaching to Arjuna an occasion.

> सर्वोपनिषदो गावो दोग्धा गोपालनन्दनः ।
> पार्थो वत्स॰ सुधीर्भोक्ता दुग्धं गीतामृतं महत् ॥

According to Sri Ramanuja the matter is even simpler According to him jnana yoga is the know ledge of the true nature of the jiva. It and karma yoga are both elements in Bhakti yoga which leads us to God Hence he defines *yoga* here thus.

आत्मज्ञानपूर्वकमोक्षसाधनभूतकर्मानुष्ठाने यो बुद्धियोगः पक्षस्य स इह योगशब्देन उच्यते ।

7 Sri Madhwa refers to Vyasasmriti which defines सांख्य thus. शुद्धात्मतत्त्वविज्ञानं सांख्यमित्यभिधीयते। He refers to Bhagavata about yoga. त्रयो योगा प्रयुक्ताः पुंसां श्रेयःप्रविवक्षया ।

नेहाभिक्रमनाशोऽस्ति प्रत्यवायो न विद्यते ।
स्वल्पमप्यस्य धर्मस्य त्रायते महतो भयात् ॥ ४० ॥

In this karma yoga there is no loss of effort begun but uncompleted nor is there disas ter from non completion Even the performance of a little of it saves us from the great terror of samsara

NOTES

1. In the case of cultivation or house-building unfinished attempt is wasted In medical treatment it leads to disasters Karma yoga is unlike these पार्थ नैवेह नामुत्र विनाशस्तस्य विद्यते—the Lord says in Chapter VI.

2. Karma leads to फल or fruit and itself dies. Karma yoga has no fruit in view and never dies. The Sruti says तमेत वेदानुवचनेन ब्राह्मणा विविदिषन्ति यज्ञेन दानेन तपसाऽनाशकेन. Such moral discipline leads to its own self-intensification.

जन्मजन्मान्तराभ्यस्तं दानमध्ययनं तपः ।
तेनैवाभ्यासयोगेन तच्चैवाभ्यसते पुनः ॥

Love of God leads to perfect purity.

सर्वपापप्रसक्तोऽपि ध्यायन्निमिषमच्युतम् ।
भूयस्तपस्वी भवति पङ्क्तिपावनपावनः ॥

3 The Sruti says तद्यथेह कर्मचितो लोकः क्षीयते एवमेवामुत्र पुण्यकृतो लोकः क्षीयते But this does not apply to Karma yoga. A mere meritorious act will lead to certain joys in heaven but the fruit of it will be worked out by enjoyment and will disappear. But this is not the case with Karma yoga. It has been said

तद्यथेहेति या निन्दा सा फलेन तु कर्मणि ।
फलेच्छां तु परित्यज्य कृतं कर्म विशुद्धिकृत् ॥

व्यवसायात्मिका बुद्धिरेकेह कुरुनन्दन ।
बहुशाखा ह्यनन्ताश्च बुद्धयोऽव्यवसायिनाम् ॥४१॥

The Buddhi or knowledge (in relation to Sankhya and Yoga) above said is steadfast and

unchanging The *buddhis* (mental states) of others who are not steadfast and rooted in truth are manifold and endless

NOTES

1 Why is this Karma yoga buddhi—mental state rooted in Karma yoga—steadfast and un changing? Sri Sankara answers प्रमाणजनितत्वात्. The plans of others are conflicting varied and manifold because they are not rooted in truth but in desire. Sri Ramanuja well says that Karma yoga is here contrasted with Kamya Karma (desire ful action)

2. It has been well said

समो हि विविधं प्रोक्तं शुद्ध चाशुद्धमेव च ।
अशुद्धं कामसङ्कल्पं शुद्धं कामविवर्जितम् ॥

3 Sri Madhwa quotes the following beautiful stanza from *Brahma Vaivarta*

बुद्धिर्निश्चितरूपानामेका विष्णुपरायणा ।
बहुशाखा ह्यनन्ताश्च बुद्धयोऽव्यवसायिनाम् ॥

4. Madhusoodana says that एका is used to show that Sankhya and Yoga have the same fruit (एकफला)

यामिमां पुष्पितां वाचं प्रवदन्त्यविपश्चितः ।
वेदवादरताः पार्थ नान्यदस्तीति वादिनः ॥ ४२ ॥

कामात्मानः स्वर्गपरा जन्मकर्मफलप्रदाम् ।
क्रियाविशेषबहुलां भोगैश्वर्यगतिं प्रति ॥ ४३ ॥

भोगैश्वर्यप्रसक्तानां तयापहृतचेतसाम् ।
व्यवसायात्मिका बुद्धिः समाधौ न विधीयते ॥

This Buddhi (knowledge of Sankhya yoga and Karma yoga) which is of the nature of steadfastness does not arise in the minds of those who are not of illumined mind and constantly speak flowery words, who rejoice in the Veda ritualistic texts and say that there is nothing higher, who are full of desire and yearn for heaven (*svarga*), who speak words relating to acts which are the cause of births as the fruit of deeds, whose utterances are full of those manifold karmas (actions) which are the means of attainment of enjoyment and power, who are deeply attached to enjoyment and power, and whose minds are stolen away by the words describing the means of attaining them

NOTES

1. The Lord here describes the stream of karma (कर्मप्रवाह) and shows what are the words and actions that keep us circling in the realm of

births and deaths and what lead to liberation and realisation

2 Only that deed is sinless and uplifting and liberating which is the doing of righteous duty in a disinterested and unattached spirit and as an offering to God. This is why the killing by a murderer is a sin while the killing by a soldier fighting in a righteous cause is a purifying and uplifting force

3. Some foolish people have said that the Lord here attacks the Vedas. How can he who is the वेद्य (known only through the Vedas) and the औपनिषदः पुरुष (the Oversoul declared in the Upanishads) attack the Scriptures He himself declares later on

> यः शास्त्रविधिमुत्सृज्य वर्तते कामकारतः ।
> न स सिद्धिमवाप्नोति न सुखं न परां गतिम् ।
> तस्माच्छास्त्रं प्रमाणं ते कार्याकार्यव्यवस्थितौ ।
> ज्ञात्वा शास्त्रविधानोक्तं कर्म कर्तुमिहार्हसि ॥

(Verses 23 and 24 Chapter XVI)

He condemns not वेद (Vedas) but Vedavadas. He merely states here that there is a higher path Karma yoga which is superior as a step to liberation to the doing of meritorious acts leading only to heaven whence the soul must return after the

enjoyment of the fruit of the acts is over. Such acts are like golden chains which bind as securely as iron chains though they are brighter and more beautiful

4. पुष्पितां वाचं The Lord refers to flowery words which like blossoms please at first sight and can further be seen from a distance but have no eternal fruits The higher paths cannot be seen from far and cannot attract us from a distance. We must go near to them and persist in them before they will yield the fullness of their divine sweetness

5 The texts referred to are those like the following

"अक्षय्यं ह वै चातुर्मास्ययाजिनः सुकृतं भवति।"

"अपाम सोममृता अभूम।"

"यस्य पर्णमयी जुहूर्भवति न पापं श्लोकं शृणोति।"

6. On the other hand we have such higher texts as the following

"परीक्ष्य लोकान्कर्मचितान्ब्राह्मणो निर्वेदमायान्नास्त्यकृतः कृतेन।"

"तद्यथेह कर्मचितो लोकः क्षीयते एवमेवामुत्र पुण्यचितो लोकः क्षीयते॥"

"प्लवा ह्येते अदृढा यज्ञरूपा अष्टादशोक्तमवरं येषु कर्म।
एतच्छ्रेयो येऽभिनन्दन्ति मूढा जरामृत्युं ते पुनरेवापियन्ति॥"

7 Thus those who do shastraic and good Kamyakarmas but are not Karmayogins are placed below the latter But let no one lay the flattering unction to his soul that the worldly men bent on worldly careers can place themselves on a level with them because they are placed on a lower plane than the Karmayogins and Sankhyayogins or that there is no virtue or efficacy in the scriptural rites. The atheists of today will stick at nothing to cry down shastraic *karmas* but they cannot be allowed to exploit Sri Krishna as their ally

8 समापौ Sri Madhwa interprets it to mean समाप्यर्पेन According to him it means a peaceful reliance on God He cites as authority the following Puranic verse

न तस्य तत्समइणाय साक्षाद्रीयसीरपि वाचस्समाधन् ।
स्वप्ने निवस्सा यहमेपि सीप्य न यस हैयानुमित स्वय स्यात् ॥

त्रैगुण्यविषया वेदा निस्त्रैगुण्यो भवार्जुन ।
निर्द्वन्द्वो नित्यसत्त्वस्थो निर्योगक्षेम आत्मवान् ॥

The Vedas have as their theme त्रैगुण्य *i e* the sum total of embodied life which is the result of the operation of the three Gunas O Arjuna, thou must become free from these Gunas (qualities), free from the various dualities of life,

ever rooted in the Sattvic quality, unabsorbed in acquisition and preservation, and full of attained self-mastery through reliance on God.

NOTES

1 In this stanza the Lord tells us that the qualities of sattva, rajas, and tamas are of the essence of the realms of mind and matter, the soul being different from them the Eternal Witness, the Eternal Consciousness, and the Eternal Bliss

2 *Guna* is properly speaking energy rather than quality the mind being the storehouse of superfine energies which are far subtler and more powerful than the energies that reside in matter This aspect will be dealt with in full in the later chapters of the Gita

3 The Lord distinguishes in this stanza the higher type of men as compared with those who are attached to *karmas* and not to *Karmayoga*. *Karmayoga* illumines us and dowers us with Eternal Bliss

4 Sri Venkatanatha explains well a very important aspect. Why should the Vedas then teach this intricate maze of Karmas? They appeal to the totality of souls who are of different grades of rootedness in *Samsara* and gives us the totality of

purifying *Karmas* leaving each soul to take up that purifying *Karma* suited to its birth and fitness Those who are not fit as yet to seek final emanci pation and in whom the mental energies have to be guided have to be led from a life of aimless activity to a life of purifying *Karmas* thence to Kar mayoga, thence to Bhakti and Jnana and thence to Moksha. Sri Ramanuja says well तमःप्रचुराणां रजःप्रचुराणां सत्त्वप्रचुराणां च [illegible] हितमुपदिशन्ति वेदाः ।

5 The only means to God realisation is the attainment of the pure *Sattvic* state by rising above the state where our Sattva guna is constantly at tacked and upset by *rajas* and *tamas*

6 It is only then that we would cease to be constantly unsettled by the dvandvas (pain and pleasure, heat and cold etc) In verse 14 the Lord has taught us the secret of the victory over these *dvandvas* If the preponderance of Sattva Guna is attained the *dvandvas* which are the result of the other two *gunas* will not affect us.

7 The Lord then tells us the means of the attainment of the sattvic state. It is dispassion the getting rid of the hankering after acquisition and preservation. योग is acquisition (अलब्धलाभ) and क्षेम is preservation (लब्धपरिपालन)

8. Then the question arises, how are we to live? Sri Madhusoodana and Venkatanatha explain आत्मवान् as meaning reliant on God The Lord says later on in the Gita तेषां नित्याभियुक्तानां योगक्षेमं वहाम्यहं Sri Madhusoodana says well आत्मा परमात्मा ध्येयत्वेन योगक्षेमादिनिर्वाहकत्वेन च वर्तते यस्य स आत्मवान् Sri Madhwa says that the Lord prohibits the acquisition and preservation of what is forbidden.

9 Sri Madhwa explains that विषय means "the apparent meaning" and says that the real inner meaning of every portion of the Vedas is the praise of God

वेदे रामायणे चैव पुराणे भारते तथा ।
आदावन्ते च मध्ये च विष्णु सर्वत्र गीयते ॥

10 There is no inconsistency between निस्त्रैगुण्य and नित्यसत्त्वस्थ. It is only through the latter that the former *viz.*, the Self established in its own glory above the Gunas स्वे महिम्नि प्रतिष्ठितः can be realised

11. I may note in passing that in त्रैगुण्यविषयाः विषयाः is explained thus by Sri Madhwa विषः=poison याः—dispellers Then the word would mean *dispellers of the poison of samsara* The natural meaning of the words in connection with the context which

deals with Karmayoga as higher than mere karmic life and as leading to Bhakti and Jnana has been already given by me.

> यावानर्थ उदपाने सर्वतः संप्लुतोदके ।
> तावान्सर्वेषु वेदेषु ब्राह्मणस्य विजानतः ॥ ४६ ॥

Whatever purpose can be attained by a small pond can be as surely attained in a large reservoir of water Even so all the fruits described in all the Vedas are included and transcended in the fruit attained by the man of renunciation who is full of God realisation

Or Just as in a large reservoir of water as well as in a small tank the thirsty man seeks only his object, (*viz.*, the water needed to quench his thirst), so in all the Vedas the man seeking liberation has the same object (*viz.*, the teaching that is the true and all sufficient means of Moksha)

NOTES

1 This verse has been a puzzle and many translators have made a mess of it The two meanings above-said bring out two aspects of the thought contained in the stanza

2. The Lord tells us why if Karmas lead to Samsara, Karmayoga should be done. It does not bind us. The bliss brought by it includes and transcends all the minor joys brought by the performance of the Vaidika Karmas. In this view the first of the two translations becomes full of meaning and beauty.

3. It has been said in the Sruti about Brahmananda "एतस्यैवानन्दस्यान्यानि भूतानि मात्रामुपजीवन्ति" "सोऽश्नुते सर्वान् कामान् सह ब्रह्मणा विपश्चिता"

4 Sri Sankaracharya explains "Brahmana" as meaning *Sanyasi* Sri Ramanujacharya explains it as meaning *Vaidika*. Sri Madhwa explains it as meaning a knower of God It does not mean one who is a mere Brahmin by birth

कर्मण्येवाधिकारस्ते मा फलेषु कदाचन ।
मा कर्मफलहेतुर्भूर्मा ते सङ्गोऽस्त्वकर्मणि ॥ ४७ ॥

Thy domain is work and not the fruits of work at any time. Do not be the source of further embodiment (as the result of action with desire for results) Neither do thou become addicted to inaction.

NOTES.

1. The selfish desire for pleasure of however

exalted a kind must go before we can have the grace of the Goddess of liberation (मोक्षलक्ष्मीकटाक्ष) It is not abstention from karma that should be aimed at but abstention from motived action which yields us only fleeting and petty results It is *Karmayoga* that leads us to Bhakti and Jnana कषाये कर्मभिः पक्वे ततो ज्ञानं प्रवर्तते ॥

There should be no giving up of duty When the soul is full of God love and God realisation *Karma* itself drops off न कर्माणि त्यजेद्योगी कर्मभिस्त्यज्यते ह्यसौ, मुमुक्षुस्तस्य पुण्यस्य ।

योगस्थः कुरु कर्माणि सङ्गं त्यक्त्वा धनञ्जय ।
सिद्ध्यसिद्ध्योः समो भूत्वा समत्वं योग उच्यते ॥

O Dhananjaya, do thy duties being rooted in *yoga* (*i.e* as an act of worship of God), abandoning attachment, and same in success and in failure Such evenness and equilibrium of mind is called *yoga*

NOTES

1 योगः भगवदुपायभूतप्रपत्तियुक्तिः Here *Yoga* means उपाय (means) The duty should be done as enjoined by the Lord by way of glad fulfilment of his commands as an act of worship of God, renouncing all results to Him as श्रीकृष्णार्पणमस्तु, and

without even praying that He should show grace as a recompense for doing the duty.

दूरेण ह्यवरं कर्म बुद्धियोगाद्धनंजय ।
बुद्धौ शरणमन्विच्छ कृपणाः फलहेतवः ॥ ४९ ॥

Mere action is far inferior to the action done with the *buddhiyoga* above said. Seek refuge in such *buddhi* Pitiable are those who work for the sake of results.

NOTES.

1. Pitiable indeed is he who does not rise through Karmayoga to Bhakti and Jnana and thence to God-love and God-realisation The Brihadaranyaka Upanishad says.

यो वा एतदक्षरं गार्ग्यविदित्वास्माल्लोकात्प्रैति स कृपणः ॥

See also

यथाचिरात्सर्वपापं व्यपोह्य परात्पर पुरुषमुपैति विद्वान् ॥

बुद्धियुक्तो जहातीह उभे सुकृतदुष्कृते ।
तस्माद्योगाय युज्यस्व योगः कर्मसु कौशलम् ॥

He who has this *Buddhi* casts off both good and evil deeds Therefore strive for such yoga. In the doing of deeds this *yoga* is of magical power.

NOTES

1 Karmayoga has the magical property of transmuting deeds from being means of bondage into being means of freedom As the उपनिषिद says.

विज्ञाय यावतस्तारा मैत्रीमति न चोरताम् ॥

(If the thief is known and served he becomes a friend and ceases to be a thief)

कर्मजं बुद्धियुक्ता हि फलं त्यक्त्वा मनीषिणः।
जन्मबन्धविनिर्मुक्ताः पदं गच्छन्त्यनामयम् ॥ ५१ ॥

Those endowed with this *Buddhi* (Karmayoga), having renounced the fruits of actions attain wisdom and becoming liberated from the bondage of birth, attain the seat which is beyond all suffering

NOTES

1 It is the mind that is the cause of bondage or leads to freedom Then by *Karmayoga* the mind is purified and action is made a means of uplift and freedom and not a source of bondage Then the soul is able to rise on the wings of Bhakti and Jnana and soar in the empyrean of divine Bliss.

2. अनामय पदं *viz.*, Moksha. This is the Lord's gracious answer to Arjuna's request. "यच्छ्रेयः स्यान्निश्चितं ब्रूहि तन्मे." (Tell me what will be surely auspicious to me).

3. Mark the steps in the golden ladder unto Moksha Karmayoga, giving up the fruits of actions, attainment of wisdom; freedom from the bondage of birth and the attainment of the Eternal bliss of God-realisation. As Sri Madhwa says well.

अकामनया ईश्वराय समर्प्य युक्तियुक्ताः सम्यग्ज्ञानिनो भूत्वा गच्छन्ति ।

यदा ते मोहकलिलं बुद्धिर्व्यतितरिष्यति ।
तदा गन्तासि निर्वेदं श्रोतव्यस्य श्रुतस्य च ॥ ५२ ॥

When thy determinate reason shall cross the turbidity of illusion then shalt thou attain a calm satiety in regard to what may be heard by you and what has been heard by you.

NOTES

1. The Lord sates when the Buddhi already described can be attained.

2 *Moha* is the illusion which clouds our sense of the eternal and the non-eternal and turns

us towards the objects of the senses in a passion of endless seeking

3 The scripture says

परीक्ष्य लोकान् कर्मचितान् ब्राह्मणो निर्वेदमायात् ॥ (After examining the action a Brahmin should attain dispassion)

4 In the Yoga Sutras Vairagya is thus defined in terms similar to those stated here by the Lord.

दृष्टानुश्रविकविषयवितृष्णस्य वशीकारसंज्ञा वैराग्यम् ।

It is the Antaranga of सम्प्रज्ञातसमाधेः (inner means) and the Bahiranga (outer means) of असम्प्रज्ञात समाधि Then comes the supreme state described in the Yoga sutras thus: तत्परं पुरुषख्यातेर्गुणवैतृष्ण्यम् ।

5. Sri Ramanuja says that Karmayoga leads to Jnanayoga which leads to the realisation of the Jiva s (soul s) true nature. As I have already stated in the Adwaita school this is the end of existence as Jiva and Brahma are one Among the Visishtad waitins such pure knowledge of the self leads to Bhakti and to the attainment of the Lord through Love, because self realisation naturally leads to God realisation

6 Sankarananda quotes in his commentary the following beautiful stanza

यदिदं मनसा वाचा चक्षुर्भ्यां श्रवणादिभिः ।
नश्वरं गृह्यमाणं च विद्धि माया मनोमयम् ॥

श्रुतिविप्रतिपन्ना ते यदा स्थास्यति निश्चला ।
समाधावचला बुद्धिस्तदा योगमवाप्स्यसि ॥ ५३ ॥

When thy determinate reason which was agitated by sacred texts (describing an infinite multitude of means and ends) stands unagitated and firm and is unshakeably rooted in the Supreme then will you attain *yoga* (God-realisation).

NOTES

1 The Lord tells us when such wisdom will lead to God-realisation

2 Sri Madhwa holds that even among Muktas there are grades of bliss This is not admitted by the other schools.

अर्जुन उवाच

स्थितप्रज्ञस्य का भाषा समाधिस्थस्य केशव ।
स्थितधीः किं प्रभाषेत किमासीत व्रजेत किम् ॥

O Keshava ! How will a man who is of steadfast and realised wisdom and who has attained *samadhi* be described by others? How will his utterance be to others? How will he sit and behave and what will be his movements?

NOTES

1 Arjuna now realising the highest illumination attained through Nishkama Karma and Bhakti and Jnana asks the Lord what will be the characteristics of the man of perfect realisation because the description of the nature of such a man is tantamount to the description of the means towards such attainment Mukta Lakshanas are Mumukshu Sadhanas.

2. In short Arjuna asks of the Lord how a man of realised wisdom will be when in *Samadhi* (union with the Infinite) and when out of *Samadhi*

3 The following beautiful verses in *Idushti* show how in *Samadhi* and out of *Samadhi* the man of realised wisdom will be full of utter peace of spirit and ecstatic devotion

यथात्स्वधारनानेऽस्मिन् क्रियत कम भूमिप ।
तस्मात्तिविनितस्य सुखाभान्यस्य नानय ॥

निवृत्तचित्तास्तु कुर्वन्तोऽपि सगक्रिया ।
आत्मैकत्वयनिष्ठाः सदैव सुखमाप्नुय ॥

यद्यपप्यासनस्यापि कृतयाधायकेपि ।
अविधान्तस्समाधस्य क समाधि कथंभवा ॥

समाहिता निवृत्ता यथाभूतार्थदर्शिनी ।
सा या समाधिशब्देन परा नञोच्यत बुधै ॥

4. In the Vâsishta the nature of the man of realised wisdom engaged in his duties when out of *Samadhi* is thus beautifully described by comparison with the mental state of woman devoted in heart to her lover though doing all her household work.

परव्यसनिनी नारी व्यग्राऽपि गृहकर्मणि ॥
तदेवास्वादयत्यन्तः परसङ्गरसायनम् ॥

एवं तत्त्वे परे शुद्धे धीरो विश्रान्तिमागतः ।
तदेवास्वादयत्यन्तर्बहिर्व्यवहरन्नपि ॥

श्रीभगवानुवाच

प्रजहाति यदा कामान्सर्वान्पार्थ मनोगतान् ।
आत्मन्येवात्मना तुष्टः स्थितप्रज्ञस्तदोच्यते ॥ ५५ ॥

When a man entirely renounces all the desires of the mind and rejoices by himself in the Self, he is described as a *Sthithaprajna* (a man of steady and realised) wisdom.

NOTES

1. The remainder of this chapter is an answer to the above question by Arjuna

2. The renunciation of desires and of the petty fleeting pain-tinged joys born of their realisation does not mean a deadness of soul but means the attainment of Infinite Bliss

न केचन जगद्भावास्तत्त्वज्ञं रञ्जयन्त्यमी ।
नागरं नागरीकान्तं कुग्रामललना इव ॥

7 Kama is due to sankalpa which is due to Vasana

काम जानामि ते मूलं सङ्कल्पात्किल जायसे ।

By Nishkama Karma, Bhakti, and Jnana we must conquer them and attain the Ineffable and infinite Bliss of God-realisation

दुःखेष्वनुद्विग्नमनाः सुखेषु विगतस्पृहः ।
वीतरागभयक्रोधः स्थितधीर्मुनिरुच्यते ॥ ५६ ॥

He is called the sage of steadfast wisdom whose mind is not oppressed by the anguish of adversity, is devoid of yearning for pleasures, and is free from attachment, fear, and anger

NOTES

1 The mind is not a mere theatre of fleeting sensations It can be concentrated and purified so as to realise the Self This method is called *yoga*.

2 This and the next stanza are the Lord's reply to Arjuna's question किं प्रभाषेत etc, How will such a seer full of steady wisdom speak to others? This is Sri Madhusoodana's view. Verse 55 deals with the sage in *Samadhi* and the later verses deal with the sage out of *Samadhi*

3 Sri Ramanujacharya s view is that verses 55 to 58 deal with the stages of perfection in the descending order Sri Madhvacharya s view is that verses 56 to 58 elucidate the various *Kamas* (desires) from which the seer is free All the teachers are agreed that these and the succeeding verses up to the end of the chapter describe the seer of attained wisdom and realisation

4 Sri Madhva says well प्रारब्धकर्मणा प्राप्तिस्थितप्रज्ञो बाधनया नानात्माभिमतिपूर्विका गमनादिवृत्तयः सम्भवन्ति

5 मुनिः मननशीलः । one habitually given to thinking and contemplation

6 As already stated these descriptions of the seer are descriptions of the *Sadhanas* of the man eager for wisdom

विद्यास्थितये प्राप्य साधनभूता प्रयत्ननिष्पाद्याः ।
लक्षणभूतास्तु पुनः स्वभावतस्ते स्थिताः स्थितप्रज्ञे ॥
जीवन्मुक्तिरितीमां वदन्त्यवस्थां स्थितात्मसम्बोधाम् ।
बाधितभेदप्रतिभामबाधितात्मप्रबोधसामर्थ्यात् ॥

Sri Sankaracharya says the same truth thus
सर्वत्रैव ह्यध्यात्मशास्त्रे कृतार्थलक्षणानि तान्येव साधनान्युपदिश्यन्ते ।

यः सर्वत्रानभिस्नेहस्तत्तत्प्राप्य शुभाशुभम् ।
नाभिनन्दति न द्वेष्टि तस्य प्रज्ञा प्रतिष्ठिता ॥ ५७ ॥

His wisdom is well-rooted who is unattached in relation to all and who has not got rejoicing or aversion when he comes by auspicious or inauspicious consequences

NOTES

1 This does not mean indifference to God The object of detachment from worldly objects is to perfect our love of God As Sri Madhusoodana says well. भगवति परमात्मनि तु सर्वथाभिस्नेहवान् भवेदेव अनात्मस्नेहाभावस्य तदर्थत्वात् इति द्रष्टव्यम् ।

2 The conquest of the senses is not the deadening of the senses but their wise direction and control by a pure will.

यदा संहरते चायं कूर्मोऽङ्गानीव सर्वशः ।
इन्द्रियाणीन्द्रियार्थेभ्यस्तस्य प्रज्ञा प्रतिष्ठिता ॥ ५८ ॥

When as a tortoise draws in its limbs he withdraws his senses well from their objects, his wisdom attains perfect equipoise.

NOTES

1. The simile is an illuminating simile and shows that as the tortoise naturally and without strain draws in its limbs, so a sage must attain a natural and easy mastery over the senses and attain the bliss of *Samadhi* Neelakantha says that a

sage shrinks in fear from the touch of worldly illusions as a *tortoise shrinks from* rough contact

2 Sri Madhusoodana says that this and the next five verses answer Arjuna's question किमासीत व्रजेत, How will the seer sit and behave? How will he when come out of Samadhi control his senses?

> विषया विनिवर्तन्ते निराहारस्य देहिनः ।
> रसवर्जं रसोऽप्यस्य परं दृष्ट्वा निवर्तते ॥ ५९ ॥

The objects of the senses turn back from him who practises abstinence. They however leave the relish behind Even this disappears when the Supreme is realised

NOTES

1 This stanza gives us a great spiritual truth. Only by renunciation and not by revelling in the senses can the scattered faculties of the mind be concentrated and purified Even then the relish for the fleeting things of life remains owing to long revelling in them The relish can cease to be only when the sweetest sweetness of God love and God realisation shines in our hearts

2. आहार: Whatever is brought in to any of the senses निराहारस्य विषयेभ्य सर्वाहृतेन्द्रियस्य (Sri Ramanujacharya)

3. The Bhagavata says

इन्द्रियाणि जयन्त्याशु निराहारा मनीषिण ।
वर्जयित्वा तु रसनामसौ रसे तु वर्धते ॥

4. Sri Ramanuja says that this verse shows the difficulty of the attainment of Jnana Nishtha and the means of its attainment

5 Sri Sankara says that this verse shows that one who by effort closes the doors of the senses can keep out the objects but the taste and relish for these will remain God-vision will accomplish this conquest of relish and desire

यततो ह्यपि कौन्तेय पुरुषस्य विपश्चितः ।
इन्द्रियाणि प्रमाथीनि हरन्ति प्रसभं मनः ॥ ६० ॥

O son of Kunti, even in the case of a striving and wise man, the turbulent senses impetuously snatch away his mind

NOTES

1 This verse describes an intermediate stage—not pure *sattva* or mere *tamas*. It describes not the seer or the sleeper but the scholar It describes the urgent need of बाह्येन्द्रियनिग्रह.

2. The Lord says that mighty effort and prayer and devotion will on the one hand slowly lessen the hold of the senses on us and on the other

hand bring us nearer to the attainment of God vision which alone will finally lead to the conquest of the senses and the subduing of the relish for worldly enjoyments.

3 The power of the senses is thus described in Manu Chap. II Verse 215

> मात्रा स्वस्रा दुहित्रा वा न विविक्तासनो भवेत् ।
> बलवानिन्द्रियग्रामो विद्वांसमपि कर्षति ॥

4 Viveka (discrimination) is the king and Yatna (effort) is the minister With their help and the help of the army of prayer and devotion and good thoughts and words and deeds we must beat off the investing armies of the senses

> तानि सर्वाणि संयम्य युक्त आसीत मत्परः ।
> वशे हि यस्येन्द्रियाणि तस्य प्रज्ञा प्रतिष्ठिता ॥ ६१ ॥

He should well control them all and sit in tranquil meditation regarding Me as the Supreme. His wisdom is steady whose senses are under his control

NOTES

1 If we seek the help of the king the thieves do not hurt us but become our servants So if we seek and get the Lord's grace, the senses will not

degrade us but will be our servants, serviceable and pure.

न वासुदेवभक्तानामशुभं विद्यते क्वचित् ।
नित्योत्सवो भवेत्तेषां नित्यश्रीर्नित्यमङ्गलम् ।
येषां मनःस्थो भगवान्मङ्गलायतनं हरिः ॥

लाभस्तेषां जयस्तेषां कुतस्तेषां पराभवः ।
येषामिन्दीवरश्यामो हृदये सुप्रतिष्ठितः ॥

2 God-love leads to conquest of the senses and leads to God-vision.

3 The Katha Upanishad says well

विज्ञानसारथिर्यस्तु मनःप्रग्रहवान्नरः ।
सोऽध्वनः पारमाप्नोति तद्विष्णोः परमं पदम् ॥

यथाग्निरुद्धतशिखः कक्षं दहति सानिलः ।
तथा चित्तस्थितो विष्णुर्योगिनां सर्वकिल्बिषम् ॥

ध्यायतो विषयान्पुंसः सङ्गस्तेषूपजायते ।
सङ्गात्संजायते कामः कामात्क्रोधोऽभिजायते ॥

क्रोधाद्भवति संमोहः संमोहात्स्मृतिविभ्रमः ।
स्मृतिभ्रंशाद्बुद्धिनाशो बुद्धिनाशात्प्रणश्यति ॥ ६३ ॥

Attachment to objects is born of musing on them; desire is born of attachment, anger is born of desire; delusion comes from anger, loss of memory results from delusion; from loss of

memory comes the ruin of discrimination, and through the ruin of discrimination he is lost

Notes

1 बाह्येन्द्रियनिग्रह (control of the outer senses) by itself is of no use because mental contemplation of the objects will lead to attachment and eventually to moral destruction Hence मनोनिग्रह is equally essential

2 The *Samskara* of *Bhavana* is the basis of knowledge and that of *smriti* is the basis of memory The *samskara* (mental impression) of *smriti* (memory) is at the very basis of our conceptual and discriminative thought When therefore intense passion clouds our memory eventually our discriminative power which alone can distinguish right and wrong is lost. Such loss is the real loss of the man himself, because then he loses his Purushartha, and what greater loss can there be than the loss of the goal of existence?

रागद्वेषवियुक्तैस्तु विषयानिन्द्रियैश्चरन् ।
आत्मवश्यैर्विधेयात्मा प्रसादमधिगच्छति ॥ ६४ ॥

But the man of disciplined mind, moving among the objects with senses free from desire and anger and controlled by himself, attains peace and clarity of soul

NOTES:

1. The *Yoga Sastras* describe these methods fully and clearly.

2. This and the succeeding 7 verses are an answer to Arjuna's question किं व्रजेत । What will be the seer's attitude to the objects of the senses ?

3. Such मनःप्रसाद (mental equipoise and purity) alone leads to God-vision

प्रसादे सर्वदुःखानां हानिरस्योपजायते ।
प्रसन्नचेतसो ह्याशु बुद्धिः पर्यवतिष्ठते ॥ ६५ ॥

When such mental peace and purity are attained, the extinction of all sorrow is attained. The discriminative faculty of him whose mind has attained peace and purity is self-poised and steadfast.

नास्ति बुद्धिरयुक्तस्य न चायुक्तस्य भावना ।
न चाभावयतः शान्तिरशान्तस्य कुतः सुखम् ॥

The knowledge of Atman comes not to him who has not attained mental equilibrium. To him who has not attained mental equilibrium comes not the uninterrupted meditation of the Self To him who has not attained such meditation comes not the great peace of realisation.

To him who has not attained such peace, whence can come the bliss of Moksha?

NOTES.

1 This verse shows the great truth that श्रवण मनन and निदिध्यासन lead to साक्षात्कार and मोक्षानन्द.

2 Only the pure in heart shall see God—that is the substance of the Lord's teaching here.

3. सुख means happiness and not pleasure. There could be no iota of joy while passion exists. Sri Sankaracharya says इन्द्रियाणां विषयसेवातृष्णातो निवृत्तिर्या तत् सुखं न विषयविषया तृष्णा दुःखमेव हि सा न तृष्णायां सत्यां सुखस्य गन्धमात्रमप्युपपद्यत इत्यर्थः । The turning back of the senses from the seeking of objects is joy. The desire for objects is not joy but pain.

इन्द्रियाणां हि चरतां यन्मनोऽनुविधीयते ।
तदस्य हरति प्रज्ञां वायुर्नावमिवाम्भसि ॥ ६७ ॥

The mind which follows blindly in the wake of the roving senses carries away the faculty of discrimination as a storm carries away a boat upon the ocean.

तस्माद्यस्य महाबाहो निगृहीतानि सर्वशः ।
इन्द्रियाणीन्द्रियार्थेभ्यस्तस्य प्रज्ञा प्रतिष्ठिता ॥ ६८ ॥

Therefore, O mighty-armed, the wisdom of that man is steadfast, all of whose senses are restrained from all their objects.

NOTES

1 Even if one sense is indulged, the succession of disasters already described will follow

2 By calling Arjuna "mighty-armed" the Lord invites him to his self-conquest also.

या निशा सर्वभूतानां तस्यां जागर्ति संयमी ।
यस्यां जाग्रति भूतानि सा निशा पश्यतो मुनेः ॥

In the time which is night to all beings, the self-controlled man is awake The time wherein all beings are awake is the time of sleep for the sage of true vision.

NOTES

1. The Lord contrasts here in felicitous terms the knower and the ignorant man The night of the ignorant is wisdom because they see nothing in it In such a night of wisdom the sage is awake The day of the ignorant is that dense darkness of *avidya* where like owls the ignorant keep up a fitful activity. In relation to such dense darkness the attitude of the sage full of the light of god-realisation is the attitude of one to the

darkness of night—a feeling of dissatisfaction and a desire to turn away from it

2 The meaning may also be put tersely thus—God is like dark night to us but the sage sees Him and enjoys Him like day The world is like day to us but the sage moves in it as in a dark night

3 The Scripture declares

यदा पञ्चावतिष्ठन्ते ज्ञानानि मनसा सह ।
बुद्धिश्च निविचेष्टेत तामाहुः परमां गतिम् ॥

4. Sri Sankara says well that in the presence of jnana avidya disappears विद्यायां हि सत्यामुदिते सवितरि शार्वरमिव तम प्रणाशमुपगच्छत्यविद्या ।

5 The Vartikakara says

अज्ञानव्यवहारे हि सर्वं वस्तु न वीक्ष्यते ।
शुद्धे वस्तुनि सिद्धे च अज्ञानव्यवहृतिस्तथा ॥

काकोलूकनिशेवायं संसारोऽज्ञात्मवेदिनो ।
या निशा सर्वभूतानामित्यवोचत्स्वयं हरिः ॥

6 The realisation of the unity of everything is thus described by the Scripture यत्र वा अन्यदिव स्यात्तत्रान्योऽन्यत्पश्येत् यत्र त्वस्य सर्वमात्मैवाभूत् तत्केन कं पश्येत् ।

आपूर्यमाणमचलप्रतिष्ठं
समुद्रमापः प्रविशन्ति यद्वत् ।

He who gives up all desires and lives in dispassion, without selfishness and egotism attaineth peace

NOTES

1 शान्ति—Moksha सर्वसंसारदुःखोपरमलक्षणां (Sri Sankara)

एषा ब्राह्मी स्थितिः पार्थ नैनां प्राप्य विमुह्यति ।
स्थित्वास्यामन्तकालेऽपि ब्रह्मनिर्वाणमृच्छति ॥

This is the Brahmic state, O Partha, on attaining which illusion ceases and by being steadfast in which, even at the close of his life, a man attains the bliss of God realisation

NOTES

1 Sri Ramanuja says well निर्वाणमयं ब्रह्म गच्छति । सुखैकतानमात्मानमाप्नोतीत्यर्थः । (Attain the bliss of the Atman)

2. Parikshit attained such bliss and Khatvanga also attained the bliss of realisation of God at the end of their lives as stated in the Bhagavata.

विहाय परमानन्दं देवताभ्यो नृपोत्तमः ।
खट्वाङ्गो नाम राजर्षिर्मुहूर्ते मुक्तिमेयिवान् ॥

Thus ends the Chapter SANKHYA YOGA

CHAPTER III

Karma Yoga.

अर्जुन उवाच

ज्यायसी चेत्कर्मणस्ते मता बुद्धिर्जनार्दन ।
तत्किं कर्मणि घोरे मां नियोजयसि केशव ॥ १ ॥

व्यामिश्रेणेव वाक्येन बुद्धिं मोहयसीव मे ।
तदेकं वद निश्चित्य येन श्रेयोऽहमाप्नुयाम् ॥ २ ॥

If, O Janârdana, Buddhi (Jnana or wisdom) is regarded by thee as superior to karma (action) why, O Kesava, dost thou order me to do this cruel work ? With speech which seems to be confused and perplexing you seem to bewilder my mind. Therefore tell me with certainty that one thing, by which I can reach the highest good.

NOTES

1. The Lord had closed Chapter II with the praise of the Brâhmisthiti which is the consummation of the Sânkhyayoga In the earlier portions of Chapter II He had praised the Karmayoga also. Arjuna wants to have a clear idea of the inter-

connection and graduatedness of these two holy and auspicious paths

2 The Gita is a *Samvada* wherein by means of a dialogue truth is brought home to the hearer s mind. It is a more natural and effective method than mere exposition or dialectics

3 Sri Sankaracharya shows that the opening portion of this Chapter shows the diversoness of Jnana and Karma and the certainty of Jnana being the sole means of self realisation If Jnana and Karma are equally necessary would Arjuna, who is a pure and qualified disciple regard them as separate and disconnected? Would the Lord reply in the same strain treating them so? Moksha is not a result of action. It is a realisation मोक्षस्य चाकार्यत्वान्मुमुक्षोः कर्मानर्थक्यम् । Tho mere non-doing which is a negative thing cannot produce a positive result. Sastra is ज्ञापक (reminding agency) and not कारक (an agency enjoining action) Hence Karma and Jnana have reference to workers on two differ ent planes (भिन्नपुरुषानुष्ठेय)

4 The steps in the golden ladder of self reali sation are thus beautifully described by Sri Madhu soodana एवं प्रथमेनाध्यायेन उपोद्घातिता द्वितीयेनाध्यायेन शास्त्रार्थ सूचितः । तथा हि आदौ निष्कामकर्मनिष्ठा ततो

ऽन्तःकरणशुद्धिः ततः शमदमादिसाधनपुरःसरः सर्वकर्मसन्यासः ततो वेदान्तवाक्यविचारसहिता भगवद्भक्तिनिष्ठा ततस्तत्वज्ञाननिष्ठा तस्याः फलं च त्रिगुणात्मकाविद्यानिवृत्त्या जीवन्मुक्तिः प्रारब्धकर्मफलभोगपर्यन्तं तदन्ते च विदेहमुक्तिः। जीवन्मुक्तिदशायां च परमपुरुषार्थावलम्बनेन परवैराग्यप्राप्तिः दैवसंपदाख्या च शुभवासना तदुपकारिण्यादेया। आसुरसंपदाख्या तु अशुभवासना तद्विरोधिनी हेया। दैवसंपदोऽसाधारण कारणं सात्त्विकी श्रद्धा आसुरसंपदस्तु राजसी तामसी चेति हेयोपादेयविभागेन कृत्स्नशास्त्रार्थपरिसमाप्तिः।

5 Thus Madhusoodana points out that the entire Sastra is stated in a nutshell in Chapter II Nishkkâma Karma is dealt with in detail in Chapter III and IV. In Chapters V and VI is described Sarva Karma Sanyasa due to the pure mind perfected by *sama*, *dama*, *etc* Thus in Chapters I to VI त्वं-पदार्थ (the soul) is clearly described to us तत्पदार्थ (God) is described in Chapters VII to XII. In Chapter XIII the identity of तत् and त्वं (God and soul) is shown In Chapter XIV we are taught त्रैगुण्यनिवृत्तिः In Chapter XV Daivi Sampat which is the supreme guide of परवैराग्य is shown In Chapter XVI and XVII the Sattviki Sraddha leading to दैवी संपत् and its opposite are described Thus in Chapters XIII to XVII we are taught सफला ज्ञाननिष्ठा. In Chapter XVIII we have the उपसंहार the conclusion and summation of the teachings of the Gita.

6 Sri Ramanuja says that the knowledge of the soul is a means to Bhakti and that Chapters II to VI describe the realisation of the soul as a means to Bhakti

7 Professor Rangachariar's interpretation of *Buddhi* as the disposition of the mind is quite against the trend of the teachings in Chapter II Arjuna regards the choice as a choice between *karma marga* and *Jnana marga* and not as one between action and motive

8 Sri Madhwacharya says that the action regarded as lower than Jnana is only mercenary action (काम्यकर्म) The discussions bearing on this in Mr Padmanabhachariar's book on the Gita show more subtlety than truth All are agreed that liberation is through wisdom and that Karma is a means to wisdom Hence Karma without love of fruit is higher than Karma with love of fruit but is lower than wisdom because each higher plane is necessarily above each lower plane

9 Professor Rangachariar's translation of (निश्चित्य) or "after ascertaining well" does not seem to be quite correct as it could imply a doubt in Arjuna's mind about Sri Krishna's knowing the truth well

श्रीभगवानुवाच

लोकेऽस्मिन्द्विविधा निष्ठा पुरा प्रोक्ता मयानघ ।
ज्ञानयोगेन सांख्यानां कर्मयोगेन योगिनाम् ॥ ३ ॥

The Blessed Lord said·

In the beginning (of creation), O sinless one, the twofold path was taught by me in this world -the path of wisdom for the Sankhyas and the path of Karma Yoga for the Yogins.

NOTES

1 The Lord here shows the distinction of path (मार्ग) according to the distinction of Adhikari Sri Venkatanatha says in his Brahmanandagiri जन्मान्तरसुकृतवशात्स्वतः शुद्धान्तःकरणस्य साक्षाज्ज्ञान एव स्थितिः । अतथाभूतस्य तु चित्तशुद्धिपर्यन्तं ज्ञानाङ्गे कर्मणि स्थितिरिति ।

2 Sri Madhwacharya instances Sanaka and Janaka as instances of the ज्ञानयोगि and कर्मयोगि respectively द्विविधा अपि जनाः सन्ति । गृहस्थादि कर्मत्यागेन ज्ञाननिष्ठाः सनकादिवत् । तत्स्था एव ज्ञाननिष्ठाश्च जनकादिवत् । मद्धर्मस्था एवेत्यर्थ ।

3 There is no inconsistency in these views A person becomes fit for ज्ञान only through karma

Among those who are full of Jnana, some are like Sanaka and some like Janaka

4 Sri Ramanujacharya says well न हि सर्वो लौकिकः पुरुषः समुत्पन्नमोक्षाभिलाषः तदानीमेव ज्ञानयोगाधिकारे प्रभवति । अपि त्वनभिसंहितफलेन केवलपरमपुरुषाराधनवेषेणानुष्ठितेन कर्मणा विध्वस्तस्वान्तमलोऽव्याकुलेन्द्रियो ज्ञाननिष्ठायामधिकरोति ।

5 The absolute need for purification through Karma is thus strongly laid down in the following verses.

अनधीत्य द्विजो वेदाननिष्ट्वा विविधान्मखान् ।
अनुत्पाद्य सुतान्विप्रो न संन्यासितुमर्हति ॥

अकुर्वन्विहितं कर्म निन्दितं च समाचरन् ।
प्रसक्तश्चेन्द्रियार्थेषु नरः पतनमृच्छति ॥

It is said further

परब्रह्म परिज्ञाय ब्रह्मैवाप्नोत्युत्तमम् ।
अन्यथा कर्म कुर्वीत न प्रमाद्येत कर्हिचित् ॥

स्वे स्वेऽधिकारे या निष्ठा स गुणः परिकीर्तितः ।
विपरीतस्तु दोषः स्यादुभयोरेष निश्चयः ॥

न कर्मणामनारम्भान्नैष्कर्म्यं पुरुषोऽश्नुते ।
न च संन्यसनादेव सिद्धिं समधिगच्छति ॥ ४ ॥

Man does not enjoy self poised freedom from action by abstention from action nor does

he attain the realisation of wisdom by mere cessation from action

NOTES

1 The Lord answers an unexpressed question by Arjuna as to why if the two paths of work and of wisdom are to be followed by men of two different types of attainment he should be directed to follow the path of action

2 The nexus of tendencies and results known as Karma has to be unwound and cast off by the processes of selfless duty, devotion, concentration and wisdom, and cannot be overcome by mere quiescence and quietism. Mere quietism may bring about a state of inactivity of the senses but the impurity and sinfulness of the mind will increase by morbid thought about sense-contacts and sense-pleasures It is not work that binds but it is motived work that binds. The *Isavasyopanishad* says

कुर्वन्नेवेह कर्माणि जिजीविषेच्छतं समाः ।
एवं त्वयि नान्यथेतोऽस्ति न कर्म लिप्यते नरे ॥

3 It has been well said

ज्ञानमुत्पद्यते पुंसां क्षयात्पापस्य कर्मणः ।
यथादर्शतलप्रख्ये पश्यत्यात्मानमात्मनि ॥
अभय सर्वभूतेभ्यो दत्त्वा नैष्कर्म्यमाचरेत् ।

4 Sri Ramanuja says thus in a beautiful sentence about this truth अनभिसंहितफलैः कर्मभिराराधितगोविन्दविध्वस्तानादिकालप्रवृत्तानन्तपापसञ्चयैरव्याकुलेन्द्रियतापूर्विकात्मनिष्ठा ह्युपपाद्या।

The same idea is tersely stated by Sri Sankara thus कर्मारम्भस्यैव नैष्कर्म्योपायत्वात्।

न हि कश्चित्क्षणमपि जातु तिष्ठत्यकर्मकृत्।
कार्यते ह्यवशः कर्म सर्वः प्रकृतिजैर्गुणैः ॥ ५ ॥

Verily no one can for even a moment rest without doing any action For every one is driven to action irresistibly by the *Gunas* (qualities) inherent in Prakriti

NOTES

1 The Prakriti Gunas drive us to action Hence to attain self poise and bliss by cessation from action is useless, for the cause *ri* Prakriti Gunas remain unsubdued We must overcome the cause to subdue the effect.

2. Sri Ramanuja points out that by past Karmas the sâttvic, râjasic and tâmasic element in us have been fed and are in full and vigorous operation and cannot be overcome by inaction but only by Dharmic Karma

प्रकृतिजन्यैः सत्त्वरजस्तमोभिः प्राचीनकर्मानुगुणप्रवृद्धैः गुणैः।

3. If mere inaction can procure salvation then trees would be liberated souls Sri Madhwa says well यदि कर्माकरणेन मुक्तिः स्यात् स्थावराणाम्

4 God-realisation leads to liberation and it cannot come till *Karma* is vanquished by Dharma

अतोऽविज्ञा परं देवं मोक्षाशा का महामुने ।
निष्कामं ज्ञानपूर्वं तु निवृत्तमिति चोच्यते ।
निवृत्तं सेवमानस्तु ब्रह्माभ्येति सनातनम् ॥

The Bhagavata says

कर्मभिः शुद्धसत्त्वस्य वैराग्यं जायते हृदि ।

कर्मेन्द्रियाणि संयम्य य आस्ते मनसा स्मरन् ।
इन्द्रियार्थान्विमूढात्मा मिथ्याचारः स उच्यते ॥ ६ ॥

He who restraining well the organs of action sits contemplating in his mind the objects of the senses is of deluded understanding and is called a hypocrite

NOTES

1 The idea is well stated by Sri Venkatanatha thus अतश्चित्तशुद्ध्यभावे केवलकर्मेन्द्रियनिग्रहमात्रस्यानर्थकरत्वान्न तद्रूपः संन्यासः ।

यस्त्विन्द्रियाणि मनसा नियम्यारभतेऽर्जुन ।
कर्मेन्द्रियैः कर्मयोगमसक्तः स विशिष्यते ॥ ७ ॥

But O Arjuna! he who, controlling the senses by the mind, begins and performs karma yoga by the organs of action in a spirit of non attachment excels (the impostor described above)

NOTES

1 The man who desires to dwell in an upper storey must build the basement and the first floor Even so must the man yearning for the self poise and bliss of Moksha do Nishkama karma

नियतं कुरु कर्म त्वं कर्म ज्यायो ह्यकर्मणः ।
शरीरयात्रापि च ते न प्रसिद्ध्येदकर्मणः ॥ ८ ॥

Perform thou the obligatory duties because action is superior to inaction If thou art inactive even the preservation of thy body could not be achieved

NOTES

1 The Hindu view is that the body should be preserved in full vitality because it is through *Karma* that the soul mounts up devotion and wisdom which lead to self liberation and self realisation Sri Ramanuja says well यावत्साधनसमाप्ति शरीरधारणं चावश्यं कार्यम् ।

2. If work causes bondage higher and purer

3. Professor Rangachariar tries to bring into his exposition the conclusions of the faithful student of our religion and the faithful student of comparative religion The faithful student of our religion is a devotee whose clarity of vision is the result of his faith The student of comparative religion is like a pedagogue asking each religion in the world to stand up and deliver an account of itself While a pedagogue deals with living boys, the student of comparative religion deals with mummies *and living boys in the shape of dead and living* religions and has a special fondness for the former The two methods of treatment are best kept apart Sri Krishna emphasises the supreme need of sacrifice as a purifier and uplifter of the soul We cannot allow His doctrine to be weakened by references to any tentative conclusions propounded by the bumptious pedagogue of comparative religion

4. What is यज्ञ? Some take it in the larger sense of unselfish action in general and others take it in the narrower sense of sacrifices Here the latter meaning is the more appropriate having regard to the text and the context Our religion emphasises the need for a moral and unselfish life of service to man even more than other religions But that is the matter for exposition elsewhere

Here the Lord deals with the question of offerings to the Devas Unselfish service to man no doubt pleases them. But in the case of the Gods who give everything to us what can we give and what do we give to them? In the case of our relations and friends who give a little to us we owe a deep debt of gratitude and seek to repay it by service and love In the case of the Gods who give us everything—nay sustain life for us even when we are in deep sleep—what can we give? Scripture which alone declares beyond doubt their existence and nature tells us how to please them We can only give them a fraction of what they have provided in plenty for us It is not the giving that is of importance as much as the spirit of the giving What is given to them as a sacrificial love-offering is again given to us by them with renewed and increased sustaining purifying and uplifting power Food eaten by us without being offered to them will be as much subject to the processes of digestion and assimilation as the food offered to them. But in the former case our appropriation of what they give is hardly a decent act worthy af self respecting beings In the latter case our sacrificial act declares and proves our gratitude and is sure to result in the sacrificial love-offering

coming back to us with added fruitfulness and blessedness As Prahlada says beautifully

नैवात्मन प्रभुरयं निजलाभपूर्ण
मानं जनादविदुष करुणो वृणीते ।
यद्यज्जनो भगवते विदधीत मान
तच्चात्मने प्रतिमुखस्य यथा मुखश्री ॥

5 But are there such gods or divine agencies in nature? The final and incontrovertible evidence about their existence is in Scripture शास्त्रयोनित्वात् From the standpoint of reason we can well see that in the case of human phenomena will is the cause of design, order, symmetry, etc In nature we see design, order etc What right have you to say that there is no operation of will there? What right have you to ascribe them to chance or to unintelligent nature? Have you seen in the world of human phenomena anything to justify your ascription of such a cause to the natural phenomena? Again, will and radiance and energy co-exist in the case of the kingdom of man You find intenser radiance and power in the world of nature On what basis do you deny the co-existence of will and intelligence in relation to them? On the other hand if the function of logic is to proceed from the known to the un-known, you should ascribe such higher and intenser radiance and energy to higher

and intenser will and intelligence You say that the gods should manifest themselves before your vision Are they school boys to obey the call of you their pedagogue? In the case of the lower energies of nature you are willing to take the intermediate steps required for the direct perception of such energies If you want to make electricity to light your room you do not issue a verbal command to it to do so You generate it you store it and then you apply the proper switch Should you not take the proper steps required for the realisation and perception of the higher energies of life? *Mantras* and *Japas* and meditation and devotion are the means for the realisation and perception of the divine spiritual energies of life Emotion and intuition and the ethical sense are certainly at least as valuable elements of us as reason and their affirmations should not be ignored

6 The divine agencies in the universe preside over nature's energies and over the even more wonderful energies of the senses and are great *bhaktas* who are *adhikarikas* or powers entrusted with certain special tasks of guidance and control by the command of the supreme Isvara Remember the life of Dhruva MaxMuller's view that

we have transferred to natural phenomena the principle of life in us by an illogical shifting of centre is absurd Our view is not that sages were children playing with the facts of life as dolls In respect of the facts of nature and the functions of life science merely gives a long name and a longer description and calls these an explanation of their cause We say that the divine agencies are the causes and that the physical predecessors of effects are only preliminary effects of other causes though science dignifies these as causes Suppose a man looses his sight through small pox. You say that small pox is the cause of the loss of vision I say that the sun who is inspirer and illuminer of the power of vision has withdrawn his *anugraha* grace owing to our sin and the first effect is small pox and the second effect is blindness Max Muller's *henotheism* theory is equally absurd as he seems to think that mankind ran in blinkers seeing only one thing at a time or that the Gods were made to come into the field of vision one after another by the gyrating machinery of a spiritual bioscope Our Vedas tell us एक सद्विप्रा बहुधा वदन्ति The sages call each god the Supreme Isvara. If man could be divine why could not the deities presiding over the different energies of nature be realised as the Supreme Lord? Such

theories as these are only one step removed from blindness of vision when compared with such ridiculous theories as those propounded by Mr T Paramasiva Iyer about the Veda embodying geological facts e g that Gayatri is marsh gas etc

7 Vaishnavas concentrate their gaze on the universal Lord who is the summation of all aspects of creative preservative and destructive power Smarthas devote their love and attention to Him as well as the various aspects above said which are the various gods with scripture declared forms and powers There are some Vaishnavas who are devotees of these as well

8 There is a certain significance in the offering of food to the Gods. The beauty of the golden corn is lost upon us like the beauty of the sun as familiarity breeds contempt The sweetest thing in life is food Indeed we express other needs by the terms hunger appetite etc if there is any divine element in life it must attach to what is the main bulk of life s action by eating and marriage leading to self preservation and race preservation If one is asked to choose between *going without food for three days and going* without votes for three months there would not be a moment s hesitation about the choice Food

is taken to sustain life The sense of taste acts as the doorkeeper allowing healthful things alone to go in So far as the primary need of life is concerned if we can have an external selective agency the sense of taste might as well be abolished If food be taken for mere enjoyment, we should always keep it on the tongue We should surrender to the gods what we hold dearest because such an act brings about a threefold blessing it generates in us habits of detachment, dispassion, and unselfishness, it pleases the gods who give us in abundance the things that sustain, delight and purify life, and what is offered comes back to us with an added power of gracious blessing. Is it anything wonderful that we should have a sacramental conception of food? Indeed any other conception of it would be ungrateful or hardly even decent Food should be pure, prepared by pure hands, free from impurity of environments, warm and rendered even purer by *mantras* It should then be offered to God and then partaken by us

9. Thus it is through sacrifices that we learn our first lessons in the finest art of life- the art of unselfish and active and dispassionate blessedness Sacrifice for blessings here and hereafter eventually leads us to work in a spirit of detachment and as a love-offering to God The spiral of ascent is like this

Sacrifice teaches us dependence on a higher power and lessens our ravenous sense of proprietorship यज्ञ is देवतोद्देशेन द्रव्यत्यागः (Giving up wealth for the sake of God) The emotion of gratitude soon ripens into the higher emotion of love The emotion of brotherhood is generated and intensified by sharing with our fellow worshippers the food offered to God Slowly the energies of dispassion and detachment and love fructify in us till the true spirit of Karma Yoga—सर्वं कृष्णार्पणमस्तु—is realised by us and this leads us to the supreme heights of God Love and God realisation (*Bhakti and Jnana*) Hence the highest peaks of the inner life really rest on the solid ground of a proper scheme of life as work and sacrifice

10 सहयज्ञैः is another reading for सहयज्ञाः Both the readings mean the same thing The former means that mankind and sacrifice were created simultaneously and the latter suggests that they were indissolubly bound one to the other Sacrifice is the means to attainment. The good things of life come of their own accord though the sacrificer has his eye on God and not on them just as though a man plants a mango tope for fruits, he gets fragrance and shade as well Even if they do not come there is the supreme blessedness of loyalty to Dharma As Apastamba says

तद्यथाम्रे फलार्थे निर्मिते छाया गन्ध इत्यनूत्पद्यते एवं धर्मं चर्यमाणं अर्था अनूत्पद्यन्ते नो चेदनूत्पद्यन्ते न हानिर्भवति ॥

11. Sri Ramanujacharya well points out that at the beginning of creation God gave sacrifice to the human soul as the chart of life so that the soul may be freed from its accumulated load of karma.

पुरा सर्गकाले स भगवान् प्रजापति. अनादिकालप्रवृत्ताचित्संसर्गविवशा उपसंहृतनामरूपविभागा· स्वस्मिन्प्रलीना. सकलपुरुषार्थानर्हाश्चेतनेतरकल्पाः प्रजाः समीक्ष्य परमकारुणिकस्तदुज्जीवयिषया स्वाराधनभूतयज्ञनिर्वृत्तये यज्ञैः सह ताः सृष्ट्वैवमुवाच ॥

12 इष्टकाम- includes also Moksha. Actions and sacrifices done in a spirit of love of results brings such results If done in a spirit of detachment and as a love-offering to God they bring to us the result of Moksha through *chittasuddhi* and *bhakti and jnana.*

देवान्भावयतानेन ते देवा भावयन्तु वः ।
परस्परं भावयन्तः श्रेयः परमवाप्स्यथ ॥ ११ ॥

Nourish and gladden the *Devas* (gods) with this, and may they nourish and gladden you. Thus nourishing and gladdening one other, you shall attain the highest good.

NOTES

1. The gods govern and guide the cosmic

functions. Sacrifice is the means of their propitiation and will lead us into the realms of bounteous blessedness.

2. Sri Ramanujacharya says that the Supreme God accepts all offerings and every worship अहं हि सर्वयज्ञानां भोक्ता च प्रभुरेव च ।

3. Sri Sankaracharya says that [illegible] means Moksha through Jnana which results from Nishkamakarma or merely *Svarga* (heaven). That heaven exists is clear because such enjoyments as unfading youth and unfading flowers (अम्लानपुष्पादि) do not exist on earth.

4. Raghavendra Swami treats the command as applicable to the lower gods and to men to fulfil duties and thereby to attain the bliss of God realisation.

5. The relation between sacrifice and prosperity is thus stated

> अग्नौ प्रास्ताहुतिः सम्यगादित्यमुपतिष्ठते ।
> आदित्याज्जायते वृष्टिर्वृष्टेरन्नं ततः प्रजाः ॥

6. Kalidasa says well in *Raghuvamsa* दुदोह गां स यज्ञाय सस्याय मघवा दिवम् । सम्पद्विनिमयेनोभौ दधतुर्भुवनद्वयम् ॥

> इष्टान्भोगान्हि वो देवा दास्यन्ते यज्ञभाविताः ।
> तैर्दत्तानप्रदायैभ्यो यो भुङ्क्ते स्तेन एव सः ॥ १२ ॥

The deities thus nourished and gladdened by sacrifice will give you all desired enjoyments He who enjoys what is given by them without offering the same to them is verily a thief

NOTES

1 Selfish enjoyment of wealth is both anti-social and irreligious and has further a corrupting effect on individual purity and goodness From the social point of view wealth is a trust for society From the religious point of view it is a blessing from above It should be offered to God and then enjoyed as his grace, and it is a trust in our hands for his other children also

2 स्तेन is interpreted by Sri Sankara as देवादिस्वापहारी (who purloins the property of the gods and does not take the same as a free and glad gift)

यज्ञशिष्टाशिनः सन्तो मुच्यन्ते सर्वकिल्बिषैः ।
भुञ्जते ते त्वघं पापा ये पचन्त्यात्मकारणात् ॥ १३ ॥

The righteous who eat the food remaining after offering as sacrifice are freed from all sins, but the sinful ones who cook for their own sakes are eating only sin

NOTES

1 Here we have a sacramental conception

of food The illogical modern man is glad when he is told that the human body is the temple of God but demurs to the sacramental conception of food which builds up the body The divine pity of the lord for man is seen in His giving us in the Gita not merely the ultimate truths of the spirit but also the holy means of God realisation including the elementary but all important means of purity of food

2 *Vaisvadeva* is believed to remove the पञ्चसूना दोषाः (the evils inevitably attendant on cooking processes)

> कण्डनी पेषणी चुल्ली उदकुम्भी च मार्जनी ।
> पञ्चसूना गृहस्थस्य ताभिः स्वर्गं न विन्दति ॥
>
> पञ्चसूना कृतं दोषं पञ्चयज्ञैर्व्यपोहति ॥

3 The following passages in Scripture may also be remembered in this connection इदमेवास्य तत्साधारणमन्नं यदिदमद्यते स य एतदुपास्ते न स पाप्मनो व्यावर्तते मिश्रं ह्येतत् ।

> मोघमन्नं विन्दते अप्रचेताः सत्यं ब्रवीमि वध इत् स तस्य ।
> नार्यमणं पुष्यति नो सखायं केवलाघो भवति केवलादी ॥

> अन्नाद्भवन्ति भूतानि पर्जन्यादन्नसम्भवः ।
> यज्ञाद्भवति पर्जन्यो यज्ञः कर्मसमुद्भवः ॥ १४ ॥

4 Sri Ramanuja says that Brahma means body and *Akshara* means Jiva This would mean that actions are done by the ensouled body and that hence the body which is *Sarvagata* i e a universal phenomenon depends on sacrifices for its being

5 Sri Madhwacharya interprets Brahma as God and Akshara as the Veda God proceeds from the Veda because He is revealed by it शास्त्रयोनित्वात् (Brahma Sutras I 1 3)

6 Sankarananda well says एव शब्दभक्षार्थ जगन्नी वनस्त्वुर्यो यह ।

7 Sri Venkatanatha says that the infinite variety of fruits in the universe is due to the variety of actions and motives God being the uniform and impartial agent assigning fruits to actions, like the rain that enables each seed to sprout according to its nature

8 Veda is called सर्वगत it illumines everything and embraces the entire cosmic life

एवं प्रवर्तितं चक्रं नानुवर्तयतीह यः ।
अघायुरिन्द्रियारामो मोघं पार्थ स जीवति ॥ १६ ॥

He who doth not follow in this world the cosmic wheel thus set in motion who liveth in

sin, and who rejoiceth in the life of the senses, he lives in vain, O Partha

NOTES

1. इन्द्रियाराम contrasted with धर्माराम and आत्माराम

2 Sri Madhusoodana refers in this connection to the Sruti अथो अयं वा आत्मा भूतानां लोकः स यज्जुहोति यद्यजते तेन देवानां लोकोऽथ यदनुब्रूते तेन ऋषीणामथ यत्पितृभ्यो निपृणाति यत्प्रजामिच्छति तेन पितृणामथ यन्मनुष्यान्वासयते यदेभ्यो ऽशनं ददाति तेन मनुष्याणामथ यत्पशुभ्यस्तृणोदकं विन्दति तेन पशूनां यदस्य गृहेषु श्वापदा वयांस्यापिपीलिकाश्च उपजीवन्ति तेन तेषां लोकः ।

यस्त्वात्मरतिरेव स्यादात्मतृप्तश्च मानवः ।
आत्मन्येव च संतुष्टस्तस्य कार्यं न विद्यते ॥ १७ ॥

But the man who finds bliss in the Self, who is satisfied with the Self, and rejoices in the Self for him there is not the obligatoriness of action.

NOTES

1 Till now the Lord described in an episodic way the obligatoriness of action and the sinfulness of inaction But in the case of those who have risen through action to realisation, the law of the obligatoriness of action ceases to be applicable

2 Only the seers who have risen to the heights of meditation communion and realisation can attain to this height The Lord ever and anon even in this discourse about Karma presents to the mind of the disciple the vision of the perfect ideal

3 मानव —is used to indicate the man of thought and realisation and may include gods also

4 रति तृप्ति संतोष—refer to three kinds of mental states रति is in relation to garlands woman etc तृप्ति is in relation to food and drink संतोष is in relation to acquisitions like cows wealth children etc.

5 The Sruti declares आत्मक्रीड आत्मरति क्रियावानेष ब्रह्मविदां वरिष्ठः । It is said also आत्मरतिरात्मक्रीड आत्ममिथुन आत्मानन्द । आत्मलाभान्न परं विद्यते । एतदेवामृतं दृष्ट्वा तृप्यति ।

6 It is well stated in the following verse that he who has realised the fulness of bliss in God cares not for the minor pleasures पर्याप्तकामस्य कृतात्मनस्तु इहैव सर्वे प्रविलीयन्ति कामाः ।

7 Sri Sankaracharya says in his Sutra Bhashya (I 1 1) [illegible] [illegible] [illegible] ह्यसौ सम्यक् सम्पद्यते कृतकृत्यता च ।

नैव तस्य कृतेनार्थो नाकृतेनेह कश्चन ।
न चास्य सर्वभूतेषु कश्चिदर्थव्यपाश्रयः ॥ १८ ॥

To him there is no selfish purpose to be attained through action Nor does he suffer any deprivation by desisting from action To him there is no dependence for any selfish purpose upon the whole realm of created being

NOTES

1. This verse, like the preceding one, describes the man of God-vision and God-realisation who has attained his exquisite bliss of Bhakti and jnana as the fulfilment and fruit of his life of Karma yoga and who is so lost in the rapture of realisation that the duties and joys of the lower realm of action have been included and transcended in a higher bliss just as the lamplight is lost and transcended in the full bright golden radiance of the noonday sun.

2 Sri Madhuscodana describes here the seven *yoga bhoomis* which form the stages in the life of him who has become so pure in heart and steadfast in mind as to be fit to vision and realise and attain God The seven stages are stated thus in *Yoga Vasishta*

ज्ञानभूमि शुभेच्छाख्या प्रथमा परिकीर्तिता ।
विचारणा द्वितीया स्यात्तृतीया तनुमानसा ॥

सत्त्वापत्तिश्चतुर्थी स्यात्ततोऽससक्तिनामिका ।
पदार्थाभावनी षष्ठी सप्तमी तुर्यगा स्मृता ॥

Vasishtha says further that these 7 stages correspond to the jagrat svapna and sushupti stages in point of intensity of perception and bliss

भूमिकात्रितयं त्वेतद्राम जाग्रदिति स्थितम् ।
यथावद्भेदबुद्ध्येदं जगज्जाग्रति दृश्यते ॥

अद्वैते स्थैर्यमायाते द्वैते प्रशममागते ।
पश्यन्ति स्वप्नवल्लोकं चतुर्थीं भूमिकामिताः ॥

पञ्चमीं भूमिकामेत्य सुषुप्तपदनामिकाम् ।
षष्ठीं गाढसुषुप्त्याख्यां क्रमात्पतति भूमिकाम् ॥

षष्ठ्यां भूम्यामसौ स्थित्वा सप्तमीं भूमिमाप्नुयात् ।
किंचिदेवैष संपन्नस्त्वथवैष न किंचन ॥

विदेहमुक्तता तूक्ता सप्तमी योगभूमिका ।
अगम्या वचसां शान्ता सा सीमा योगभूमिषु ॥

3 Sri Bhagavata thus describes the seer full of God vision and God realisation as one who is in the state of such ecstacy of bliss that the comings and goings of fleeting pleasures and pains have no effect on him

देहं च नश्वरमवस्थितमुत्थितं वा
सिद्धो न पश्यति यतोऽध्यगमत्स्वरूपम् ।
दैवादुपेतमथ दैववशादपेतं
वासो यथा परिकृतं मदिरामदान्धः ॥

The Sruti declares

तद्यथाऽहिनिर्ल्वयनी वल्मीके मृता प्रत्यस्ता शयीतैवमेवेद शरीरं शेतेऽथायमशरीरो मृत प्राणो ब्रह्मैव तेज एव ।

4 As among the seven planes of yogic realisation above-said it is said that the first three are the means, that the fourth is the state of wisdom, and that the last three are the stages of jivanmukti

चतुर्थी भूमिका ज्ञान तिस्र स्यु साधन पुरा ।
जीवन्मुक्तेरवस्थास्तु परास्तिस्र प्रकीर्तिता ॥

5 Sri Madhwa quotes the following beautiful line विष्णावेव रतिर्यस्य क्रिया तस्यैव नास्ति हि ।

6 It is well said

ज्ञानामृतेन तृप्तस्य कृतकृत्यस्य योगिनः ।
नैवास्ति किंचित्कर्तव्यमस्ति चेन्न स तत्त्ववित् ॥

तस्मादसक्तः सततं कार्यं कर्म समाचर ।
असक्तो ह्याचरन्कर्म परमाप्नोति पूरुषः ॥ १९ ॥

Therefore, do thou always perform without attachment the obligatory duties, for by performing action without attachment, man verily reaches the Supreme

NOTES

1 तस्मात् Neelakantha says this means because unattached work is not a cause of bondage यस्मान्निष्कामस्य कर्मलेपो नास्ति

2 Only *Muktas* and *Jivanmuktas* are so lost in the ecstatic visioning of God that action has fallen off from them Others and even men of wisdom in moods of व्युत्थान (awareness of the world) must do their duties in life Sri Madhwacharya says well यतोऽस्मज्ञातयमापरत्र कार्याभाव तस्मात्कर्म समाचर ।

3 Sri Ramanujacharya interprets पर as meaning the jivatma This means that the person pursuing the path of Nishkama Karma will realise the true nature of the soul and that then through Bhakti the bliss of God realisation will result

कर्मणैव हि संसिद्धिमास्थिता जनकादय ।
लोकसंग्रहमेवापि संपश्यन्कर्तुमर्हसि ॥ २० ॥

Janaka and others have indeed attained perfection through action alone, and even from the point of view of the welfare of the world by not swerving from the path of righteousness, thou shouldst perform action

NOTES

1 The various stories about Janaka's life show how he was an ideal *Karmayogi*.

2 The combination of work and unselfishness is difficult and the elimination of selfish motive

from work has to be slowly attained by strenuous effort and God's grace

3 Such unselfish work removes the low pleasure of selfish enjoyment during success and the keen sting of disappointment during failure, helps the progress of country and humanity, and leads us to that state of inner purity and peace which lead to the bliss of God-love and God-realisation

4. लोकसंग्रह- लोकस्योन्मार्गप्रवृत्तिनिवारणम् । (the preventing of Adharmic action by the world)

5. Janaka is specially mentioned because a King can best guide his people in the paths of righteousness by being righteous himself सर्वे राजाश्रिता धर्मा राजा धर्मस्य धारकः ।

यद्यदाचरति श्रेष्ठस्तत्तदेवेतरो जनः ।
स यत्प्रमाणं कुरुते लोकस्तदनुवर्तते ॥ २१ ॥

Whatsoever a superior man does, that other men also do. Whatsoever he acts on as authoritative, that is followed by the world at large.

NOTES

1. The heroisms of self-control and obedience to the Lord's commandments are necessary not only to the individual but also for the solidarity of society.

2. Sri Ramanuja well says अन्यथा लोकनाशन जनित पाप ज्ञानयोगात्प्रच्यावयेत् (The sin of misleading and ruining others will overthrow him from his Jnanayoga if his conduct is not all right and he does not take care about it in his fancied superiority as a *Jnanayogi*)

न मे पार्थास्ति कर्तव्यं त्रिषु लोकेषु किंचन ।
नानवाप्तमवाप्तव्यं वर्त एव च कर्मणि ॥ २२ ॥

In all the three worlds O Partha, there is not for me any obligatory action that must be done nor is there anything unattained that has to be attained Yet I remain in action

NOTES

1 The Lord besides giving a large number of convincing reasons finally instances himself as the supreme example of a Karma Yogi

2 The Lord s work is His Leela. It is due to the abundance of His Grace and for the betterment of humanity (लोकसंग्रह)

3 The Lord is not a *Baddha* or *mukta* (soul in bondage or liberated soul) He is the Paramatma who is अपारसमस्तकाम, सत्यकाम, सत्यसंकल्प, Omnipotence Omniscience and Omnipresence and when yet out

of His Grace (अनुग्रह) comes into the world of men to uphold righteousness and draw the eyes and hearts of all to His lotus feet by His Beauty and His Love

यदि ह्यहं न वर्तेयं जातु कर्मण्यतन्द्रितः ।
मम वर्त्मानुवर्तन्ते मनुष्याः पार्थ सर्वशः ॥ २३ ॥

If I do not continue in action incessantly and without indolence, men would in all respects and directions follow in that path of mine, O Partha.

उत्सीदेयुरिमे लोका न कुर्यां कर्म चेदहम् ।
संकरस्य च कर्ता स्यामुपहन्यामिमाः प्रजाः ॥

If I do not engage in action, these worlds would perish I should be the cause of confusion of births, and I should thus ruin all these created beings.

NOTES.

1. Duty (Dharma) is what keeps the worlds in tune and leads souls to God Hence Iswara as the Lord of Duty is ever declaring it by words and conduct धर्मो विश्वस्य जगत प्रतिष्ठा. Wordsworth says of Duty

Thou dost preserve the stars from wrong
And the most ancient heavens through thee
are fresh and strong

2 The breach of duty leads to Dharma sankara and Varna sankara and destroys the orderly upward evolution of life I have referred to this already in Chapter I and shall refer to it again in Chapter IV

सक्ताः कर्मण्यविद्वांसो यथा कुर्वन्ति भारत ।
कुर्याद्विद्वांस्तथासक्तश्चिकीर्षुर्लोकसंग्रहम् ॥ २५ ॥

Just as the unenlightened do work O Bharata, in a spirit of attachment to action, so should the enlightened man do work without attachment and with a desire for the proper guidance and welfare of the world

NOTES

1 The difference is one of motive. The heart is the seat of worldliness or Godliness according as we train it and purify it. Blessed are the pure in spirit, for they shall see God

न बुद्धिभेदं जनयेदज्ञानां कर्मसंगिनाम् ।
जोषयेत्सर्वकर्माणि विद्वान्युक्तः समाचरन् ॥ २६ ॥

Let no learned man cause an unsettlement

of mind among those who have not become full of wisdom and who are yet attached to work. He should cause all actions to be done, himself doing them in the proper spirit of *yoga*.

NOTES

1 The Lord says that the truly wise man should induce all to do their duties, slowly introducing the element of the higher motive which transforms the lead of work into the gold of love and bliss, by himself doing duty in the proper spirit of unattached work for pleasing the Lord

2 It has been said

अज्ञस्यार्धप्रबुद्धस्य सर्वं ब्रह्मेति यो वदेत् ।
महानिरयजालेषु स तेन विनियोजितः ॥

3 Religious propagandism, overthrowing of beliefs, and unsettlement of minds are not God's work. The truly divine work is effecting a conversion of the heart, leaving the duties unaltered

प्रकृतेः क्रियमाणानि गुणैः कर्माणि सर्वशः ।
अहंकारविमूढात्मा कर्ताहमिति मन्यते ॥ २७ ॥

He whose mind is clouded by egoism regards himself as the doer in respect of all actions which are done by the qualities of Prakriti

NOTES

1 The Prakriti spoken of here is not the self active and independent *Prakriti* of the Sânkhyas but the Parameswari sakti which gives suitable embodiments to jivas as the result of actions and binds them or frees them in accordance with viola tion of or obedience to the Lord's commandments. Such *sakti* is thus described in our sacred books

देवात्मशक्तिं स्वगुणैर्निगूढाम् ।
मायां तु प्रकृतिं विद्यान्मायिनं तु महेश्वरम् ॥

तत्त्ववित्तु महाबाहो गुणकर्मविभागयोः ।
गुणा गुणेषु वर्तन्त इति मत्वा न सज्जते ॥ २८ ॥

O mighty-armed he who knows the truth about the diversities of qualities and actions, realising that the senses which are natural qua lities move amidst the objects which are also natural qualities is not attached

NOTES

1 Such a clear discerner knows that the soul is not the principle of association with things but it is the mind which is in a state of relation to objects.

2 Hence the soul is free and realised as free from all the infinite complexities of causes and

effects in nature Then Ahamkara (egoism) and Mamakara, the acquisitive and possessive sense cease to hold sway over us

3 In a beautiful and telling passage the Scripture shows how the soul identifies itself with the mind and the senses and the object

अन्धो मणिमविन्दत् । तमनङ्गुलिरावयत् । अग्रीवः प्रत्यमुञ्चत् । तमजिह्वो असश्चत ।

4 Buddhi, ahamkara, the senses, and the objects are all गुणविभागाः The कर्मविभागाः depend on them

5 Sri Madhusoodana takes गुणकर्मविभागयोः as गुणकर्म on the one hand and विभाग which means Atman on the other. The author of Bhashyotkarsha Deepika criticises this view. Indeed he seldom omits an opportunity of attacking Madhusoodana

6 This stanza shows that in this universe of matter and energy, the needs of the organism which are the effects of *gunas* and the cause of *karmas* are not connected with the soul which is *sachidananda*. The predominance of a particular *guna* determines our mental outlook and our consequent actions Hence man ought to take care of the work as well as the motive

प्रकृतेर्गुणसम्मूढाः सज्जन्ते गुणकर्मसु ।
तानकृत्स्नविदो मन्दान्कृत्स्नविन्न विचालयेत् ॥२९॥

Those who are deluded by the qualities of Prakriti are attached to the actions done by the gunas The man of perfect knowledge should not unsettle those men of imperfect knowledge and dull comprehension

NOTES

1 He should not, as already pointed out in my notes to verse 26 take away their attachment to work but should introduce slowly the transforming element of Nishkâmakarma that will lead through devotion and wisdom to liberation

2. कृत्स्न means 'The All *i.e.*, God This is well brought out by the following verses

सदेवेत्यादिवाक्येभ्य कृत्स्न वस्तु यतोऽद्वयम् ।
समस्तव्यतिरिक्तस्य कुतोऽकृत्स्नस्य वस्तुता ॥
यस्मिन्दृष्टेऽप्यदृष्टोऽयं स तदन्यश्च दिश्यते ।
तथा दृष्टेऽपि दृष्टः स्यादकृत्स्नस्तादृगुच्यते ॥

The Sruti also says:

आत्मनो वा अरे दर्शनेन श्रवणेन मत्या विज्ञानेनेदं सर्वं विदितम् ।
अस्मिन्विज्ञाते सर्वमिदं विज्ञातं भवति ।

3. Sri Ramanujacharya expounds the truth contained in this verse in his own masterly way

ते किल मन्दाः श्रेष्ठजनाचारानुवर्तिनः कर्मयोगादुत्थितमेन दृष्ट्वा कर्मयोगात् प्रचलितमनसो भवेयुः। अतः श्रेष्ठः स्वयमपि कर्मयोगे तिष्ठन्नात्मयाथात्म्यज्ञानेन आत्मनोऽकर्तृत्वमनुसंदधानः कर्मयोग एवात्मावलोकने निरपेक्षसाधनमिति दर्शयित्वा तानकृत्स्नविदो जोषयेत्॥

मयि सर्वाणि कर्माणि संन्यस्याध्यात्मचेतसा।
निराशीर्निर्ममो भूत्वा युध्यस्व विगतज्वरः॥ ३०॥

Do thy work of fighting, surrendering unto me all actions, with thy mind realising that thou art the servant of God, free from attachment to results and from a desire of selfish possession, and free from burning grief and anxiety.

NOTES:

1 The realisation that God has His purposes achieved through us is one of the great liberators from sin and bondage We are His servants and we must do our duty as His servants He is the *Antaryamin* अन्तः प्रविष्टः शास्ता जनानां सर्वात्मा. See also Gita XVIII, 61 Our illusion of our being कर्ता will be overcome by this means This is consistent with the further realisation that the real agents in work are the mind, the senses, and the body, the soul being साक्षी (witness) and Sacchidananda A fur-

ther realisation is the realisation of its identity with Paramatma Much confusion of thought arises when we utter all these realisations without realising their interconnection and gradation The immediate agents in work are Prakriti Gunas and the ultimate agent is God who is the lord of Prakriti So long as we are under the illusion of the soul being the doer and enjoyer and do not realise that the soul is *sakshi* and *sachidananda* we are bound to the wheel of *samsara* The realisitions abovesaid free us from such illusion The Lord is in no way affected by our actions because He is like rain bringing each seed unto fruition and fulfilment according to its true and essential nature

2. Only when we realise these truths, we will be inclined to surrender the fruits of actions to God and pray that He may scatter the blessed results of the actions broadcast over the world for the joy of mankind The torture of the selfish prayer of individual happiness will leave us only then The mere intellectual assent to the doctrine that the Prakriti gunas are the real agents in work is of no use Our illusion is too strong to be destroyed by a mere intellectual assent The doing of duties irrespective of consequences and by way of carrying out His commandments to win His grace

slowly generates our intense realisation of our true nature. The conquest of illusion is only by such means and by none other To such a soul full of *sraddha* and striving God gives the bliss of realisation. If you rely on God and realise that He is the real agent in human actions His grace will give the fullness of *jnana*. The importance of such faith is taught in the following verses

> ये मे मतमिदं नित्यमनुतिष्ठन्ति मानवः ।
> श्रद्धावन्तोऽनुसूयन्तो मुच्यन्ते तेऽपि कर्मभिः ॥

Those men who follow this teaching of mine ceaselessly, full of faith and free from cavil, they also are freed from the bondage of actions.

NOTES

1. Three grades of Godwardness are indicated here. Follow His teachings, at least have faith, in any event do not cavil These persons though below the jnanayogi are all wending Godward.

2 Such is the importance of *sraddha* or faith. The Lord emphasises this in Chapter IV verses 39- 40

3. The Agneya Purana says

श्रुतिमात्ररसाः सूक्ष्माः प्रधानपुरुषेश्वराः ।
श्रद्धामात्रेण गृह्यन्ते न करेण न चक्षुषा ॥
श्रद्धा धर्मः परः सूक्ष्मः श्रद्धा ज्ञानं हुतं तपः ।
श्रद्धा स्वर्गश्च मोक्षश्च श्रद्धा सर्वमिदं जगत् ॥

4. What is *sraddha* ? शास्त्राचार्योपदिष्टेऽर्थेऽननुभूतेऽप्येवमेवैतदिति विश्वासः [Madhusoodana] It is faith that what is taught by scripture and teacher is true

5 Quite opposed to it is Asuya (असूया). It is गुणेषु दोषाविष्करणं (saying that good qualities are really defects trying to prove that what acts are pronounced to be auspicious are causes of our undoing denying the truth of virtues, etc) Hiranya kasipu was the worst of cavillors and sceptics and athiests. So was Sisupala. Such souls cannot rise to the Supreme

6 Faith is not opposed to reason. Reason belongs to the world of the senses Faith is the instrument of realisation and the organ of truth in the super sensuous world That the mind and the senses are the real agents is *clear to us from reason* (*Samkhya*) That God is the ultimate agent is the *declaration of faith* That God and soul are one in bliss is the *realisation*

7 *Asuya* is also described as परोत्कर्षासहिष्णुत्व (inability to put up with the superiority of another)

If one will not accept the glory and power of God but cavils at him and disobeys His laws, there is no hope for him

8 The faith that leads to hatred of other religions or men is not faith ; it is *ahamkara*. Pure faith increases our love of God and man and always takes us nearer to God-realisation

ये त्वेतदभ्यसूयन्तो नानुतिष्ठन्ति मे मतम् ।
सर्वज्ञानविमूढांस्तान्विद्धि नष्टानचेतसः ॥ ३२ ॥

But those who, being given to carping and decrying, do not follow this teaching of mine know them to be men of diverse ignorance in respect of all forms of wisdom, lost men, and men of lost mind

NOTES

1 This terrible indictment is quite legitimate, because if after such revelation from such divine lips we are full of doubt or despair or dislike we are indeed lost souls

2 The moods of agnosticism and athiesm bar the door to self-realisation and God-realisation.

3 Reason is the revealer, and faith the impeller The army of low impulses and desires has

to be overthrown by the sword of faith and not by the lamp of reason

4 Neelakantha says that ब्रह्म means God Chapter VI of the Gita says ब्रह्म समाप्नोति सतोऽचि ब्रह्म । Madhusoodana says that अप्रतर्क्यः relates to the sum total of knowledge relating to Karma and Brahma and Saguna and Nirguna He points out also the process of decline of अचेतस सर्वज्ञानविमूढान् and नष्टान् (i e, with unilluminated minds deluded as to all truth and lost) The Lord states later on in the Gita

> तानहं द्विषतः क्रूरान्संसारेषु नराधमान् ।
> क्षिपाम्यजस्रमशुभानासुरीष्वेव योनिषु ॥
> आसुरीं योनिमापन्ना मूढा जन्मनि जन्मनि ।
> अप्राप्य मां निपतन्त्यधमामधमान्तिकमनि ॥

5 Sankarananda says that the Lord condemns those who give up action and are unfit for renunciation कर्म प्रकृत्यावर्तनाख्य कृतार्थविद्य अप्रकृत्य यात स्वस्वन्याय एव परमपुरुषार्थ विपरीतं ज्ञात्वा सन्यासानर्हानकर्म निष्ठान् जनाप्रधान् विनष्टपुरुषार्थानित्याह ॥

> सदृशं चेष्टते स्वस्याः प्रकृतेर्ज्ञानवानपि ।
> प्रकृतिं यान्ति भूतानि निग्रहः किं करिष्यति ॥३३॥

Even the man of knowledge acts in accor-

dance with his own nature All beings follow nature. What can restraint avail ?

NOTES

1. This is in answer to Arjuna's assumed question as to why if following the Lord's teaching confers such blessings all persons do not follow it

2 प्रकृतिः is that portion of the sum-total of of our good and evil acts and tendencies which attain fruition and expression in this life Sri Sankaracharya says पूर्वकृतधर्माधर्मादिसंस्कारो वर्तमानज-न्माभिव्यक्त सा प्रकृति Sri Ramanujacharya says that प्रकृति means प्राचीनवासना Sri Madhwacharya says that it means पूर्वसंस्कार ।

enough purity and power to counteract the currents of desire fed from a thousand springs in previous births.

6 The theory of innate good or evil nature is propounded by Sri Madhwacharya but is rejected by the other schools of thought I think that a calm study of our scriptures will show that it is baseless. The soul is pure consciousness and bliss. The Karmic and physical inheritance is what is called nature and we have to free ourselves from our burdens by karma bhakti and jnana. Karma is not opposed to God's omnipotence God is law as well as Love

न कर्मत्वमीशस्य हीयते नास्तिता यत ।
अतएव भगवान्सर्वेशानीश्वरत्वैव निर्मिता ॥

इन्द्रियस्येन्द्रियस्यार्थे रागद्वेषौ व्यवस्थितौ ।
तयोर्न वशमागच्छेत्तौ ह्यस्य परिपन्थिनौ ॥ ३४ ॥

For each sense there abide in its object attachment and aversion We must not come under their sway They are our real enemies in the (Godward) path

NOTES

1 The Lord then shows how the nature of each man consisting of his tendencies can be over-

come and perfected Else if the nature of each man bears him irresistibly along its currents, what is the use of scriptures at all? Our tendencies generate a feeling of attachment e g to forbidden food and a feeling of aversion e g to enjoined duties The scripture teaches us the evil of harmful but liked things Will any one eat food which he knows to be poisoned however hungry he may be? Will any one turn away from a disliked medicine if he knows that it will save his life?

2 Hence the initial desires due to pre-acquired tendencies none can control But man's freedom and choice lie in his power of restraining action and curbing desire through the help of study, good company, and divine grace Madhusoodana says well तत्र पुरुषाकारस्य शास्त्रस्य चायं विषयो यत्तयोर्वशं नागच्छेदिति ।

3 Nowhere in the world is such a convincing solution of the problems of free-will and predestination given as in this verse Madhusoodana says ततश्चाप्रतिबद्धं शास्त्रं विहिते पुरुषं प्रवर्तयति निषिद्धाच्च निवर्तयतीति शास्त्रीयविवेकविज्ञानप्राबल्येन स्वाभाविकरागद्वेषयोः कारणोपमर्देनोपमर्दात्न प्रकृतिर्विपरीतमार्गे पुरुषं शास्त्रदृष्टे प्रवर्तयितुं शक्नोतीति न शास्त्रस्य पुरुषकारस्य च वैयर्थ्यप्रसंग. ।

4 Venkatanatha well points out that प्रकृति becomes a factor in action only through रागद्वेष,

Scriptures enable us to overcome these बहुना च प्रमाणा गुरुस्य प्रामनिर्मात्रा मनवात । एव स्थित तथा तामुद्वमाय सर्वो न नश्रिति नाधेन नियम्यते ।

5 Hence the proper and fruitful method is not the dissociation of the sense from the object which often intensifies the longing but the elimination of the feeling of strong desire by a realisation through the aid of scripture of evil consequences Our sum total of tendencies becomes potent only when allied to attachment and aversion We feel in forbidden pleasures a sense of bliss and an ignorance of future ill we feel in occasions of duty a *sense of ease and an ignorance* of the future good of doing duty Scripture destroys these wrong notions Hence Prakriti by itself is not of dynamic power

6 It may well be asked then what is the meaning of the previous verse which says that nature is powerful and that compulsion has no controlling power? Sridhara says that Shastra (scripture steps in as a boat and saves us from being carried along the current of Prakriti and takes us across if we get into it But if we have already got into the deep waters of desire and do not get into the boat then of course there is no help

7 Sri Ramanuja points out that this verse means that राग and द्वेष cannot be conquered by merely taking up Jnanayoga and that the path of Karmayoga is far better

श्रेयान्स्वधर्मो विगुण परधर्मात्स्वनुष्ठितात् ।
स्वधर्मे निधनं श्रेयः परधर्मो भयावहः ॥ ३५ ॥

Far more auspicious is one's own duty though not of meritorious character than another's duty well performed Better is death in the discharge of one's duty than life in the discharge of another's duty The duty of another is fraught with fearful consequences.

NOTES

1. The previous verse having taught the elimination of passion, how can there be any dislike of our duty ? So the Lord insists on each doing his duty

2 Men's duties are determined by their qualitative potentialities which become operative at birth. But social arrangements and individual upbringing may help or hinder the discharge of such duties Higher spirituality depends however on the proper discharge of such duties in the proper spirit The equipment of fitness and the equipment of motive are both indispensable.

3 The disobedience to this rule has not only personal but also social consequences As a matter of fact all action has in one sense the stamp of Prakriti on it It is not of the soul There is no question of higher or lower in the realm of duties All are equally related to the centre of God as the radii are equally related to the centre in a circle If our duty is properly done and in the right spirit it results in the highest self realisation of the soul

4 Sri Ramanuja expounds all these verses as showing that Karma yoga is better than ज्ञान or Jnana yoga The other commentators take them as showing how Karma yoga is to be effectively performed by the conquest and elimination of desire A man who merely acts is a karmi but he who acts in the manner taught by the Lord is a Karma yogi

अर्जुन उवाच—

अथ केन प्रयुक्तोऽयं पापं चरति पूरुषः ।
अनिच्छन्नपि वार्ष्णेय बलादिव नियोजितः ॥ ३६ ॥

Arjuna said—

But by whom is a man impelled to commit sin, O Varshneya as if he, though not desiring sin is constrained by compulsion to do so?

Notes

1. Arjuna puts this question to get a definite answer. Who is the impeller to action? God, or Dharma and Adharma, or Raga and Dvesha? Is the soul helpless? Is it the mere theatre of a play or a mere playground for us? Can it overcome all opposition and attain to the highest? Are all the causes of equal potency? Who is the real foe of the Jiva? How can he be vanquished? Arjuna wants to know all this so that he may follow the Lord's commandments and win His grace

2 Man is not an automaton He is a moral agent His previous Karmas and vasanas determine his birth and outlook He should not give up his duty and take up other duties He should and could do his duties in a Nishkama (desireless) spirit That is his privilege as well as his obligation If Arjuna took up sanyasa, that would be fruitless *Nigraha* or self-compulsion But if he fought in a *Nishkama* spirit he will be following the bent of his nature and will at the same time win the Lord's grace Duty is pre-ordained , but purity or impurity, virtue or sin, is of our making In this respect we are free and responsible agents ; Our Karmas determine our jati, life, and enjoyment, Our Vasanas give us the initial tendencies to choice

but we can and should overcome desire and sin and if we do not we must suffer Here is the only true reconciliation of determinism and freedom.

3. Arjuna wants to know who is the most active and dreaded foe of man and the Lord tells him about this

4 Sri Ramanuja says that Arjuna asks why the jnana yogin is impelled into a life of enjoyment. According to him all these verses are intended to show the superiority of karma yoga over jnana yoga

श्रीभगवानुवाच—

काम एष क्रोध एष रजोगुणसमुद्भवः ।
महाशनो महापाप्मा विद्ध्येनमिह वैरिणम् ॥ ३७ ॥

The Blessed Lord said

He is desire; he is anger, he is born of Rajo guna; he is all consuming and all sinful know him to be the enemy in this world

NOTES

1 Sri Sankaracharya explains in this verse what Bhagavan means It means the perfection of supremacy virtue, fame, auspiciousness, dispassion and freedom

5 In the case of an enemy there are four methods of dealing with him साम, दान, भेद दण्ड (peace gift, diplomacy and war) In the case of this enemy the first three methods are useless The more you give, the more he takes The more friendly you are the more domineering he becomes. Nor can diplomacy avail Kind *treatment is suicidal.*

Vice is a monster of so frightful mien
As to be hated needs but to be seen.
But seen too oft, familiar with her face,
We first endure, then pity then embrace —(*Pope*)

Hence दण्ड is the only proper method in the case of *Lama*

6 Sri Sankaracharya points out that only kama is transformed into krodha (anger) when desire is obstructed in its progress towards enjoy ment. It is stated कामात् क्रोधोऽभिजायते [illegible]

7 Verses 62 and 63 in Chapter II show how the succession of soul-deluding states arise

8. In Santiparva Mahabharata kama is compared to a tree of which all other passions are parts and the soul is tied to it by iron chains.

[illegible] ।
[illegible] ॥

तस्य चाज्ञानमाधारः प्रमादः परिषेचनम् ।
सोऽभ्यसूयापलाशो हि पुरादुष्कृतसारवान् ॥
संमोहचिन्ताविटपः शोकशाखो भयाङ्कुरः ।
मोहिनीभिः पिपासाभिर्लताभिरनुवेष्टितः ॥
उपासते महावृक्षं सुलुब्धास्तत्फलेप्सवः ।
आयसैः संयताः पाशैः फलदं परिवेष्ट्य तम् ॥

9 Such is the power of Kama It is said

अकामस्य क्रिया काचिद्दृश्यते नेह कर्हिचित् ।
यद्यद्धि कुरुते जन्तुस्तत्तत्कामस्य चेष्टितम् ॥

धूमेनाव्रियते वह्निर्यथादर्शो मलेन च ।
यथोल्बेनावृतो गर्भस्तथा तेनेदमावृतम् ॥ ३८ ॥

As fire is enveloped by smoke, as a mirror by dust, as an embryo by the womb, even so is this (self-consciousness of the soul) enveloped by it (Kama or desire.)

NOTES

1 The three illustrations represent different degrees of density of envelopment Also, as Sri Desikar points out, the first illustration shows that desire is co-existent as smoke with fire, constantly reverts as dust to the mirror, and envelops us so fully as the womb envelops the foetus, that for release expert aid is necessary. Sri Madhu-

soodana explains another aspect. In the first stage desire is not so forceful just as smoke surrounds the fire but does not lessen its power to burn. In the second stage it is more powerful and dims the soul as dust dims the mirror and deprives it of its reflecting power. But the mirror is visible. In the third stage it is very powerful and grips and hides the soul as the foetus is hidden and imprisoned. Sankarananda says that the Lord emphasises the difference between desire and wisdom. The former is dark opaque and inanimate; the latter is bright transparent and animate. The former colours the soul dark as smoke colours the fire dark; it destroys the transparency and reflecting power of the soul as dust destroys the same of the mirror; and it makes the soul lifeless as the amnion renders the embryo a helpless prisoner. Dhanapati says that the three illustrations show that desire prevents knowledge from revealing the Atman; it next prevents the seeing of things as they are and it finally destroys discrimination. Sri Madhwa says that the illustrations represent the action of desire on three classes of souls. He quotes from Brahma Tarka:

> तत्र काम ज्ञानिनः सर्वं धूमवदावृणोत् ।
> शुभमप्यावमनं क्रमादावृत्य तिष्ठति ॥

आवृतं ज्ञानमेतेन ज्ञानिनो नित्यवैरिणा ।
कामरूपेण कौन्तेय दुष्पूरेणानलेन च ॥ ३९ ॥

Knowledge is enveloped by this desire, which is the incessantly active foe of the wise Such desire is hard to fulfil and is insatiable

NOTES

1 Sri Sankaracharya says that desire is the incessantly active foe of the wise man, for only the latter sees the operations of the enemy. The fool is under the domination of desire and knows nothing about the foe In the case of this meaning नित्यवैरिणा goes with ज्ञानिनः ।

2 Or ज्ञानिनो may go with ज्ञान and desire may be viewed as the enemy of all But the former is clearly the better meaning

3 The word अनल is used to mean insatiable or a flame नाग्निस्तृप्यति काष्ठानां ।

इन्द्रियाणि मनो बुद्धिरस्याधिष्ठानमुच्यते ।
एतैर्विमोहयत्येष ज्ञानमावृत्य देहिनम् ॥ ४० ॥

The senses, the mind, and the will are said to be his seats; by means of these he deludes the jiva (soul) by veiling his wisdom

NOTES

1 Buddhi is the will the region of concepts and determinations. Mind is the lower region of motor impulses and sensory impressions. The senses are the channels of knowledge. Kama goes through the outer gates and finally captures the fort and then the citadel Hence watch the gates. Each sensation of pleasure will not be an enemy but for the co-ordinating mind and will that remember and associate pleasures with objects under the sway of desire

2. In connection with this we must remember the beautiful simile in the Kathopanishad about the soul being the owner of a chariot (m- the body) the will being the charioteer the mind being the reins, and the senses being the horses. In the Bhagavata (skandha IV Chapter 25) the Puranja nopakhyanam brings out the inter relations of the soul and the senses in a telling way

3. The Lord tells us the stronghold of the enemy so that we may kill him Else he will trouble us again and again Sri Madhvacharya says well यथार्थे मनोऽभिमानमाह । इन्द्रियाभिमानो हि मनुष्यादि ।

तस्मात्त्वमिन्द्रियाण्यादौ नियम्य भरतर्षभ ।
पाप्मानं प्रजहि ह्येनं ज्ञानविज्ञाननाशनम् ॥ ४१ ॥

Therefore, O chief of Bharatas, controlling first the senses, kill him (desire) who is sin and who is the destroyer of knowledge and realisation

Notes

1 ज्ञान is book-learning विज्ञान is realisation

2 The purification of mind and will has to follow the control of the senses Only then it will succeed.

इन्द्रियाणि पराण्याहुरिन्द्रियेभ्यः परं मनः ।
मनसस्तु परा बुद्धिर्यो बुद्धेः परतस्तु सः ॥ ४२ ॥

The senses are said to be higher than (the body), the mind is higher than the senses, the determinative faculty is higher than the mind; and He is higher than the determinative faculty.

Notes

1. *Manas* is the mind in which the alternations of doubt and determination exist. *Buddhi* is the mind in the state of determinateness

2 The above translation brings out what is the aid of the higher power to conquer and control the lower power From each lower plane which is

under the control of kama or desire he has to be dislodged with the help of the higher power

3 That this is the meaning is clear from the corresponding verses in the Kathopanishad

इन्द्रियेभ्यः परा ह्यर्था अर्थेभ्यश्च परं मनः ।
मनसस्तु परा बुद्धिर्बुद्धेरात्मा महान्परः ॥

महतः परमव्यक्तमव्यक्तात्पुरुषः परः ।
पुरुषान्न परं किंचित्सा काष्ठा सा परा गतिः ॥

4. The region of steadfastness and clarity of ideas is Buddhi It is from there that the light of intellection comes. It is itself illumined and vitalised by the Atman The realised self identity of the soul is the background which renders memory and coherence of mental life possible. The will is the channel of the ultimate illumination and energy which brighten and sustain everything

5 Sri Ramanuja says that स is desire. According to him the verse means that we have various enemies—the senses the mind reason and desire—the last being the arch-enemy But this interpretation is against the spirit of the Katha Upanishad mantras above stated. Further though the impure mind is our enemy the pure mind is our friend and helper

6 Sri Madhwa says that what are described in this verse are the divinities presiding over the senses, the mind, etc

NOTES

1 The Lord shows that only through God's grace can be overthrown the basis nescience (मूलाज्ञान) which is the real origin of desire

2 The arch enemy if he is merely beaten may return and give trouble So the Lord tells us what are his strongholds what are his real sources of power what are our aids in overthrowing him and how he is to be destroyed

3 As the Kathopanishad says

यदा सर्वे प्रभिद्यन्त हृदयस्येह ग्रन्थयः ।
अथ मर्त्योऽमृतो भवत्यत्र ब्रह्म समश्नुते ॥

CONCLUDING REMARKS

1 Sri Madhusoodana sums up the teaching of this Chapter thus:—

उपाय कर्मनिष्ठात्र प्राधान्येनोपसहृता ।
उपेयाज्ञाननिष्ठा तु तद्गुणत्वेन कीर्तिता ॥

The Karmayoga which is the means of self realisation is the chief topic of the chapter The blessedness of wisdom which is the goal is also hinted at in it

2. Sri Yamunacharya thus sums up the chapter

senses. He must dedicate to the Supreme his actions and the fruits thereof Then only will he attain peace and perfection. The chief enemy in his path is *Kama or desire* His favourite seats are the senses the mind and the intellect Dislodge him from these by the control of the senses perfected by the control of the mind Seek the aid of God for this end and slay the arch-enemy of the soul and live in eternal bliss. Such are the teachings of the third Chapter of the Bhagavad Gita

Thus ends the Chapter KARMA YOGA

CHAPTER IV

Karma Brahmarpana Yoga.

श्रीभगवानुवाच--

इमं विवस्वते योगं प्रोक्तवानहमव्ययम् ।
विवस्वान्मनवे प्राह मनुरिक्ष्वाकवेऽब्रवीत् ॥ १ ॥

The blessed Bhagavan said :

I told this Eternal Yoga to the Sun-God; He taught it to Manu, and Manu taught it to Ikshvaku.

NOTES

1 The topics dealt with in this chapter are thus described in Sri Yamunacharya's Gitartha Sangraha

प्रसङ्गात्स्वस्वभावोक्तिः कर्मणोऽकर्मतास्य च ।
भेदा ज्ञानस्य माहात्म्यं चतुर्थेऽध्याय उच्यते ॥

2. Sri Sankaracharya says that the Lord has summed up His gracious doctrine and now gives up its blessed geneology to show that it is वेदार्थ (the essence of the Veda) योऽयं योगोऽध्यायद्वयेनोक्तो ज्ञाननिष्ठालक्षणः ससन्यासः कर्मयोगोपायः यस्मिन् वेदार्थः परिसमाप्तः प्रवृत्तिलक्षणो निवृत्तिलक्षणश्च, गीतासु च सर्वास्वयमेव योगो विवक्षितो भगवता । अतः परिसमाप्तं वेदार्थं मन्वानस्तं वंशकथनेन स्तौति श्रीभगवान् ।

3 The topics described in the verse above quoted are further clearly detailed in Sri Ramanuja charya s introduction thus

तृतीयेऽध्याये प्रकृतिवियुक्तस्य मुमुक्षोः सहसा ज्ञानयोगेऽनधिकारात् कर्मयोग एव कार्यः ज्ञानयोगाधिकारिणोऽप्यकर्तृत्वानुसंधानपूर्वककर्मयोग एव श्रेयानिति सहेतुकमुक्तम् विशिष्टतया व्यपदेश्यस्य तु विशेषतः कर्मयोग एव कार्य इति चोक्तम्। चतुर्थेनेदानीमस्य कर्मयोगस्य निखिलजगदुद्धारणाय मन्वन्तरादावेवोपदिष्टतया कर्तव्यतां द्रढयित्वा अन्तर्गतज्ञानतयाऽस्यैव ज्ञानयोगाकारतां प्रदर्श्य कर्मयो।स्वरूपं तद्भेदाः कर्मयोगे ज्ञानांशस्यैव प्राधान्यं चोच्यते। प्रसङ्गाच्च भगवदवतारयाथात्म्यमुच्यते॥

4 Sri Madhvacharya says with a brevity that is quite consistent with thoroughness

पुरः परस्य माहात्म्यं कर्मभेदा ज्ञानमाहात्म्यं चोच्यतेऽस्मिन्नध्याये।

5 Narayana is thus not merely the causeless first cause of the Universe but also its आदिगुरु (first teacher) The familiar stanzas ' यो ब्रह्माणं विदधाति पूर्वम् " and "नारायणं पद्मभुवं वसिष्ठम्" show this.

6 Some pseudo-scholars have seen in the geneology some significant omission of Brahmin teachers. There are different lines of teaching as there are separate beams from the central Sun The teaching must be given only to *adhikaris* (those

fit for initiation) These will lead other fit persons to the truth. "स्वयं तीर्णः परान् तारयति"

7. The Yoga is called *Avyaya* as it gives the eternal fruit of Moksha

एवं परंपराप्राप्तमिमं राजर्षयो विदुः ।
स कालेनेह महता योगो नष्टः परंतप ॥ २ ॥

The royal seers knew what it was they thus handed down in uninterrupted succession. This yoga, by long lapse of time, has declined in the world, O slayer of foes.

NOTES

1 The importance of uninterrupted transmission of knowledge is stated in this verse

2 The yoga declined because it came into the hands of those who were not strong of soul दुर्बलानजितेन्द्रियान्प्राप्य नष्टं योगम् (Sri Sankaracharya)

स एवायं मया तेऽद्य योग प्रोक्तः सनातनः ।
भक्तोऽसि मे सखा चेति रहस्यं ह्येतदुत्तमम् ॥

The very same eternal Yoga has been declared to thee today by me, because thou art my devotee and my friend; it is the supreme secret.

NOTES

1 The knowledge has to be conserved and imparted to good men The Scripture says

'विद्या ह वै ब्राह्मणमाजगाम गोपाय मावशेवधिष्टेऽहमस्मि।
असूयकायानृजवेऽयताय न मा ब्रूया वीर्यवती तथा स्याम्।'

अर्जुन उवाच—

अपरं भवतो जन्म परं जन्म विवस्वतः।
कथमेतद्विजानीयां त्वमादौ प्रोक्तवानिति॥४॥

Arjuna said —

Your birth was recent, whereas the birth of the Sun God was ancient How can I know that you declared this at the beginning ?

NOTES

1 The old controversy as to whether Arjuna knew the divinity of Sri Krishna or not and why he put the question is not of much interest. We may take it that he put it to know the full truth from the divine lips and to make his question a means of enlightening humanity for all time.

श्रीभगवानुवाच—

बहूनि मे व्यतीतानि जन्मानि तव चार्जुन।
तान्यहं वेद सर्वाणि न त्वं वेत्थ परन्तप॥५॥

2 Arjuna had two doubts 1 Did the Lord, incarnate in another body, teach the Sun God? If so, how could he remember that while he (Arjuna) could not remember his past actions? 2 If the Lord, incarnate in this very body, taught the Sun-God, how could this body have existed at the beginning of creation? The present verse contains the solution of the first doubt

3 The Jiva is तिरोभूतज्ञानशक्तिः and hence cannot remember the past births His body is due to Karma (कर्मवश) The Lord is अप्रतिहतज्ञानशक्तिः and to him the Past, the Present and the Future is one Infinite Present His incarnation is due to His mercy and not due to any Karma.

4. The Lord uses परंतप to show that Arjuna may be a vanquisher of outer enemies but it is more difficult to vanquish the inner enemies

अजोऽपि सन्नव्ययात्मा भूतानामीश्वरोऽपि सन् ।
प्रकृतिं स्वामधिष्ठाय सम्भवाम्यात्ममायया ॥ ६ ॥

Though I am unborn and am of eternal nature and though I am the Lord of all beings, self controlling mine own Prakriti, I incarnate through my Maya.

NOTES

1 The Lord's incarnation is not due to any desire. आप्तकामस्य का स्पृहा । भोक्तृत्वं भीमाकैवल्यम् ।

2 The Lord's Auspicious Form is Eternal नित्यैव सा जगन्मूर्तिः ।

3 The Lord's Incarnation is unlike the *Jiva's* reincarnation The former is due to His unfettered Mercy the latter is due to *Karmic* compulsion Both are however eternal

4. The Lord though master of *Prakriti*, is through His Maya born by his gracious wish to be embodied in Prakriti to save erring humanity अजायमानो बहुधा विजायते—says *Sruti* (Scripture)

5 God's immanence and trancendence and

His omniscience and omnipotence are in no way inconsistent with His gracious incarnation.

पूर्णमदः पूर्णमिदं पूर्णात्पूर्णमुदच्यते ।
पूर्णस्य पूर्णमादाय पूर्णमेवावशिष्यते ॥

6 The doctrine of Incarnation is the sole possession and peculiar glory of Hinduism

7. There are full incarnations i.e पूर्णावतार (likeKrishna), and also *Amsavataras* (अंशावतार) i e partial manifestations

8. A beautiful stanza in the Bhagavata says that the Lord's birth as son to human beings is like the birth of the full moon in the Eastern sky—an occasion and not an effect.

देवक्यां देवरूपिण्यां विष्णुः सर्वगुहाशयः ।
आविरासीद्यथा प्राच्यां दिशीन्दुरिव पुष्कलः ॥

(X Skandha, 3rd Adhyaya, Verse 8)

9. God uses Prakriti to disclose human manifestation But He is the lord of Prakriti while the jiva's human embodiment is due to the power of Prakriti

10 The three Indian schools of thought quarrel over the reality or the apparent character of the incarnation and the significance of Maya But the fight is more apparent than real In relation

to the Cosmos the Lord has various विश्वमयत्वविभुत्व Apart from such relation to the world He is Sacchi dananda. Emphasis on either aspect brings about the quarrels of logicians. But the scripture is clear enough on the point. Whether the embodiment is called सगुणत्व or अप्राकृत, the fight is mainly one of words and not one of facts.

11 It has been well said

देवानां कार्यसिद्ध्यर्थमाविर्भवति सा यदा ।
उत्पन्नेति तदा लोके सा नित्याप्यभिधीयते ॥

12 If He who is beyond the planes of mind and speech and sight can come into the plane of mind is there anything to obstruct His coming into the plane of speech or the plane of vision?

13 The following verses are beautiful and reveal to us beautiful aspects of the same truth

कृष्णमेनमवेहि त्वमात्मानमखिलात्मनाम् ।
जगद्धिताय सोऽप्यत्र देहीवाभाति मायया ॥
अहो भाग्यमहो भाग्य नन्दगोपव्रजौकसाम् ।
यन्मित्र परमानन्द पूर्णं ब्रह्म सनातनम् ॥

(*Krishnakarnamrita*)

14. The two words प्रकृति and माया relate to the same truth मायां तु प्रकृतिं विद्यात्. They are both used here to indicate the material and the power देवात्मशक्तिं स्वगुणैर्निगूढाम् । Sri Sankaracharya says in

his Sutra Bhashya · स्यात्परमेश्वरस्यापीच्छावशान्मायामयं रूपं साधकानुग्रहार्थम् । Sri Ramanujacharya says that माया means संकल्प. Sri Madhvacharya says that it means ज्ञान or इच्छा. Sri Venkatanatha objects to this. But in the light of what I have stated above it is clear that these meanings are not in vital conflict with the proper advaitic conception of *Maya* distinguishing between Maya in relation to the Cosmos and Maya in relation to Brahman.

यदा यदा हि धर्मस्य ग्लानिर्भवति भारत ।
अभ्युत्थानमधर्मस्य तदात्मानं सृजाम्यहम् ॥ ७ ॥

O Bharata, whenever there is the weakening of Dharma and there is the rise of Adharma, I create Myself

NOTES

1. *Dharma* referred to here is Varnashrama Dharma, the source of all good here and hereafter. Such is the description and interpretation in Sri Sankaracharya's Bhashya वर्णाश्रमादिलक्षणस्य प्राणिनामभ्युदयनिश्रेयससाधनस्य

2. Dhanapati says that the Lord indicates that Arjuna, being a man born in the holy land and the line of Bharata should not act against Dharma

nd that hence he is addressed by the Lord as Bharata in this verse

3 The Lord says that He incarnates whenever Dharma is overborne by Adharma

4. It is not to be understood that the Lord can effect the suppression of Adharma only by incarnating in the world His will is enough. But out of His grace to show his beauty and Love to all and draw their eyes and hearts to His lotus feet and *to establish Dharma by precept* and practice He incarnates in the world Sri Madhvacharya says न च मनैव परित्राणादिकं कार्यमिति नियमः । तथापि लीलया स्वभावेन यथेष्टचारी । तथा चोक्तं । देवस्यैष स्वभावोऽयम् । लोकवत्तु लीला कैवल्यम् ।

> परित्राणाय साधूनां विनाशाय च दुष्कृताम् ।
> धर्मसंस्थापनार्थाय सम्भवामि युगे युगे ॥ ८ ॥

For the protection of the righteous and the destruction of the unrighteous and for the firm establishment of Dharma, I incarnate from *yuga* to *yuga*

NOTES

1 The Incarnation does not wait till there is नाश (destruction) of धर्म He comes when there is ग्लानि (languishing) of Dharma and when there is

the rising up (अभ्युत्थान) which is far less than the triumph of Adharma

2 These are times when He comes himself as in the case of Lord Krishna At other times we have *Amsavataras* and *Avesavataras* The present stanza and the preceding stanza refer to these two facts

3 The important thing to remember is that in both cases the cause is His grace and His incarnation is not like our birth which is कर्मवश (due to the power of *Karma*)

4 Incarnations take place more than once in the same yuga when the conditions require the Lord's incarnation

5. Sri Madhvacharya well refers to a scriptural passsage which says

पूर्णोऽयमस्यात्र न किंचिदाप्य तथापि सर्वाः कुरुते प्रवृत्तीः ।

6 Such punishing of the wicked also is for their good and out of love and grace The निग्रह (punishment) is really *Anugraha* (grace) It is well said लालने ताडने मातुर्नाकारुण्य हि यथार्भके । तद्वदेव महेशस्य नियन्तुर्गुण-दोषयो ॥

जन्म कर्म च मे दिव्यमेवं यो वेत्ति तत्त्वतः ।
त्यक्त्वा देहं पुनर्जन्म नैति मामेति सोऽर्जुन ॥ ९ ॥

He who thus truly knows my divine birth and action, does not on leaving the body attain birth again but attains Me, O Arjuna

NOTES.

1 He who knows and realises the Lord truly attains Him

2 तत्त्वतः तत्त्व — स्वभाव (nature)

वीतरागभयक्रोधा मन्मया मामुपाश्रिताः ।
बहवो ज्ञानतपसा पूता मद्भावमागताः ॥ १० ॥

Freed from attachment, fear and anger realising oneness with me, taking refuge in Me —many persons, purified by the austerity of wisdom, have attained My being

NOTES

1 Knowledge is the true and effective liberator The Lord says न हि ज्ञानेन सदृशं पवित्रमिह विद्यते ।

2. परम तप is thus defined मनसश्चेन्द्रियाणां च ऐकाग्र्यं तप It is the steady direction of the mind and the senses towards Him

ये यथा मां प्रपद्यन्ते तांस्तथैव भजाम्यहम् ।
मम वर्त्मानुवर्तन्ते मनुष्याः पार्थ सर्वशः ॥ ११ ॥

In whatever way men approach me, even

so do I come to them. O Partha, from all directions, men tread the path that leads to me.

NOTES

1. The fruit is proportioned to the desire and the endeavour Those who desire fruits lower than Moksha get them He gives jnana to the Mumukshu. He gives Moksha to those who yearn for liberation and practise perfect renunciation as stated in the last verse The Lord says later on

चतुर्विधा भजन्ते मां जनाः सुकृतिनोऽर्जुन ।
आर्तो जिज्ञासुरर्थार्थी ज्ञानी च भरतर्षभ ॥

2. Sri Nilakantha well says that he who loves or hates man who is God's reflection loves or hates God and gets fitting fruit This does not mean God's kindness or unkindness but such is His law which is also Love He says ततश्च मद्बिंबभूते प्राणिजाते यथा यः प्रीतिं द्वेषं वा करोति तस्मिन्प्रतिबिंबभूतेऽहमपि प्रीतिं च द्वेषं च करोमि । बिंबपूजापरिभूवौ प्रतिबिंब एव संक्रामतोऽतो न मम वैषम्यनैर्घृण्ये स्त । तस्माच्छ्रेयोऽर्थिना सर्वस्य कल्याणायैव यतितव्यमिति भावः ।

3 A passage in the Agneya Purana says

अन्यदेवतपूजापि यस्मिन्नन्ते समर्पिता ।
स्वर्गादिफलहेतु स्यान्नान्यथा त भजेद्धरिम् ॥

4. Hence the Lord has no preferences The

fruit is proportioned to the desire and the endeavour

काङ्क्षन्तः कर्मणां सिद्धिं यजन्त इह देवताः ।
क्षिप्रं हि मानुषे लोके सिद्धिर्भवति कर्मजा ॥ १२ ॥

Those who desire the fulfilment and success of actions worship the Gods because the successful fruition of actions is quickly attained in the world of men

NOTES

1 The Lord says that all do not realise the supreme Lord because desirous of quick fruitions of actions men seek the grace of various deities by worship They are unable to rise to the heights of निष्कामकर्म and निष्कामभक्ति. But even they tread His path because such worship will generate eventually Nishkama Karma and Bhakti and lead to the attainment of the Supreme

2. The Lord says later on

येऽप्यन्यदेवताभक्ता यजन्ते श्रद्धयान्विताः ।
तेऽपि मामेव कौन्तेय यजन्त्यविधिपूर्वकम् ॥

चातुर्वर्ण्यं मया सृष्टं गुणकर्मविभागशः ।
तस्य कर्तारमपि मां विद्ध्यकर्तारमव्ययम् ॥ १३ ॥

The fourfold caste division was created by me

through differentiations of Guna and Karma (quality and action) Though I am the creator of it, know that I am the eternal non-doer and witness

NOTES

1 The Lord explains why it is that men take to diverse forms of search and worship It is owing to their potential deeds and desires that have led to their birth They follow My path as their birth into the various castes is due to My direction It is on earth that men do work as the result of potential deeds and desires and attain to the lower or the higher fruitions according to their faith and endeavour

2 चातुर्वर्ण्यं has been defined as चत्वारो वर्णा एव चातुर्वर्ण्यम् ।

3 Diverseness of desires and deeds is due to diverseness of initial endowment of potential desires and deeds Sri Madhusoodana says शरीरारम्भकगुणवैषम्यादेव न सर्वे समानस्वभावाः · But all tend eventually towards His path and all fulfil their being by work and worship.

4 Nilakantha says that the Lord's view is that He has created the world of men conformably to deeds and desires, and as all the devatas are His

children worship to th so also pleaseth Him यथापान्तुरस्मै पुत्रक्रमशः पश्र ततोऽस्य दयानामति मनुष्याणामीक्षा पितुरिव तत्रात्मा ममैव कृपासतीत्वमः ।

5 गुणकर्मविभागशः — Divergence of qualities and deeds are the cause and the effect of births. These are the result of creation and not subject to human alterations. But this does not mean any disparagement or inequality. Certain qualities and deeds are common to all (सामान्यधर्म) others are differentiated according to birth विशेषधर्म in the doing of the actions enjoined on each caste and भक्ति which is common to all bring the same blessed fruits to all. Divergence of actions does not mean divergence of hearts. The caste system is perfectly compatible with peace love and democratic equality and is in fact the only secure basis of these.

न मां कर्माणि लिम्पन्ति न मे कर्मफले स्पृहा ।
इति मां योऽभिजानाति कर्मभिर्न स बध्यते ॥ १४ ॥

He who knows that actions do not bind me and that I have no desire for the fruits of action is himself not bound by its actions

NOTES.

1. The Lord says that his action not being due to desire but being due to grace and mercy

do not fetter him with the bonds of reincarnation and birth He is always Perfect and Free. आप्तकामस्य का स्पृहा.

2 He who realises God like this is himself freed from the fetters of birth -because in him also the drivings of desire and the false sense of कर्तृत्व (agency) cease to be

3 The Ishopanishad says well

कुर्वन्नेवेह कर्माणि जिजिविषेच्छत समाः ।
एवं त्वयि नान्यथेतोऽस्ति न कर्म लिप्यते नरे ॥

4 Naradiya Purana says

कर्तापि भगवान्विष्णुरकर्तेति च कथ्यते ।
तस्य कर्ता यतो नान्य. स्वतन्त्रत्वान्महात्मन ॥

5 God's actions are due to grace and mercy and not to desire and passion

अकांक्षन्नपि देवोऽसौ नेच्छते लोकवत्परः ।
न ह्याग्रहस्तस्य विष्णोर्ज्ञानि कामो हि तस्य तु ॥

6 Realising Him and His *Leelas* results in our attaining similar freedom from the bondage of actions

ज्ञात्वा तमेनं मनसा हृदा च भूयो न मृत्युमुपयाति विद्वान् ।

एवं ज्ञात्वा कृतं कर्म पूर्वैरपि मुमुक्षुभिः ।
कुरु कर्मैव तस्मात्त्वं पूर्वैः पूर्वतरं कृतम् ॥ १५ ॥

Knowing thus, action was performed by the ancient seekers after liberation Do thou, therefore, perform action as did our forefathers in the olden time.

NOTES

1 If we have not yet realised Truth we must do our duty for the attainment of purity and vision. If we have realised it we must do duty for the sake of the proper guidance of the world Sri Sankaracharya says: यद्यनात्मज्ञस्त्वं तदात्मशुद्ध्यर्थं तत्त्वविच्चेत् लोकसंग्रहार्थम् ।

2. That the path has been trodden by the ancient seekers and seers is a proof of its being the right path.

A beautiful stanza in the Bhagavata says.

एष एव हि मोक्षस्य शिवः पन्थाः सनातनः ।
यं पूर्वे चानुसंतस्थुर्येन याति जनार्दनः ॥

किं कर्म किमकर्मेति कवयोऽप्यत्र मोहिताः ।
तत्ते कर्म प्रवक्ष्यामि यज्ज्ञात्वा मोक्ष्यसेऽशुभात् ॥ १६ ॥

Even sages are bewildered as to what is action and what is non action I shall therefore declare to you what is action, by knowing which you shall be freed from the bondage of inauspiciousness (i.e., samsara or brith and death)

NOTES

1 The Lord emphasised in the previous verse the fact that the auspicious path of Dharma was that trodden by the ancient seekers after liberation Why did the Lord emphasize in this? Was there any difficulty in knowing the path? Yes, says the Lord, it is difficult to know the true path I shall reveal it to you

2 Further, what is required is not a blind following of the path trodden by the ancient seekers, but an intelligent following of it आवश्यकत्वेऽपि न कर्मणो गतानुगतिकतयानुष्ठानं कर्तव्यम्। किं तु "ज्ञात्वा कर्माणि कुर्वीत" इति वचनात् कर्माश्रितं किंचिद्विशेषं ज्ञापयितुमुपोद्घातयति (Sridhara)

3 Sri Ramanujacharya says that अकर्म means the nature of the soul, अकर्मेति कर्तुरात्मनो यथात्मज्ञानमुच्यते ।

कर्मणो ह्यपि बोद्धव्यं बोद्धव्यं च विकर्मणः ।
अकर्मणश्च बोद्धव्यं गहना कर्मणो गतिः ॥ १७ ॥

One must know the nature of the enjoined action; one must know also the nature of what is the prohibited action; and one must futher know the nature of non-action Mysterious is the true nature of action.

NOTES

1 Doing enjoined actions and refraining from prohibited actions and realising the detached nature of the soul—must be intelligent acts and not acts blindly done

2 The Chhandogya Upanishad says यदेव विद्यया करोति श्रद्धयोपनिषदा तदेव वीर्यवत्तरं भवति ।

3. The Lord means to lay down here the true nature of *Pravritti* and *Nivritti*.

4 Sri Ramanujacharya takes अकर्म to mean ज्ञान and विकर्म to mean विविधकर्म i.e. नित्यनैमित्तिककाम्य कर्माणि ।

5 Sri Madhva interprets कर्मणः as— कर्म भ· (viz Karma is from God) So also विकर्म and अकर्म are from God. They flow from a Divine cause and hence the difficulty to fathom them.

> महात्मा भगवान् कस्य कर्माकर्मविकर्मकम् ।
> दर्शनं याति हि सुमे क्वचो बुध्दिम तद्दिना ॥

कर्मण्यकर्म यः पश्येदकर्मणि च कर्म यः ।
स बुद्धिमान् मनुष्येषु स युक्तः कृत्स्नकर्मकृत् ॥ १८ ॥

He who sees non-action in action and action in non-action is the wise one among men; he is the *yogi* and he is the full performer of action

and we do not protect him एवमीश्वराज्ञाया अकरणेऽपि प्रत्यवायः परित्यागमात्राद्विकर्मणि प्रत्यवायः ।

5 Even karma becomes *akarma* (inaction) if there is no *Sraddha* faith and *Vikarma* if there is दम्भ (ostentation)

अश्रद्धया हुतं दत्तं तपस्तप्तं कृतं च यत् ।
असदित्युच्यते पार्थ न च तत्प्रेत्य नो इह ॥

यत्रादि कर्माण्यमयकारणं मम ......
मानामहादिमृत मानमीन माननापीडमुत माननम ॥

6 Sridhara points out that the non-doing of an enjoined act is like the doing of a prohibited act in the production of evil consequences अकर्मणि च विहिताकरणे कर्म यः पश्येत् प्रत्यवायहेतुत्वेन कर्मपहेतुत्वात् ।
Nilakantha also says विहिताकरणं प्रतिषिद्धकरणे च कर्मैव भवत् । अकर्मतो विकर्मत्वम महास्ययाः कुर्यात् न स्वकर्मापि शास्त्रदृष्टया कुर्यादित्यर्थः ।

7 The true non action is when through action action falls off and the soul attains ब्राह्मी स्थिति ।
न कर्माणि त्यजेद्योगी कर्मभिस्त्यज्यते ह्यसौ ।

8 Another philosophic meaning of this stanza is given by Madhusoodana He who sees *Akarma* (Brahma) in karma jnana rupa (action of the form of jnana) and who sees *karma* (the whole cosmos) in Akarma the subject is the truly wise man

9. Sri Madhvacharya gives us another aspect. He says that we must see *akarma* (that we are not the real doers and that god is the real agent) in karma and that we must see *karma* (god's ever watchful protective work) even in *akarma* (our inaction and sleep). Karma, according to this great teacher, means here jiva, and akarma means god. कर्मणि क्रियमाणे सति अकर्म यः पश्येद्विष्णोरेव कर्म नाहं चित्प्रतिबिम्ब किञ्चित्करोमीति ।

10 Sri Ramanujacharya says that *akarma* is *jnana*, that *karmayoga* and *jnanayoga* (in the sense of the realisation of the nature of the *jiva*, आत्मयाथात्म्य-ज्ञान), are interdependent and interconnected, that the proper doing of *karma* is when we know the real nature of the soul and that the realisation of the nature of the soul is an internal karma

11 The idea contained in this verse is thus stated in Srimad Bhagavata

यथा भ्रमरिकादृष्ट्या भ्राम्यतीव नभोन्तरम् ।
चित्ते कर्तरि तत्रात्मा कर्तेवाहंधिया स्मृत ॥

12 The commentaries contain mutually destructive criticisms in regard to the meanings and aspects indicated above. I strongly deprecate the revival of such controversies, because when we adopt the method which I beg leave to adopt and to suggest as the right method of a compositeness of out-

look in which all angles of vision have a place in the fulness of realisation all concordant notes have a place and have each its due place.

13. Janaka and Suka are our highest examples to illustrate the meaning of this great verse.

यस्य सर्वे समारम्भाः कामसङ्कल्पवर्जिताः ।
ज्ञानाग्निदग्धकर्माणं तमाहुः पण्डितं बुधाः ॥ १९ ॥

The wise men call him a man of realisation whose undertakings are all free from desire and egotism and whose actions are burnt up by the fire of wisdom

NOTES

1. Sankalpa (egotism) is the cause of *kama* (desire)

2. The wise man's work will be due to his desire of helping the world's evolution (lokasangraha) or the bare maintenance of his body (जीवनमात्रार्थं)

3. The scripture says.

यदा सर्वे प्रमुच्यन्ते कामा येऽस्य हृदि श्रिताः ।
अथ मर्त्योऽमृतो भवत्यत्र ब्रह्म समश्नुते ॥

4. The conquest of the bondage of karma is thus described in the following *sutra*

तदधिगम उत्तरपूर्वाघयोरश्लेषविनाशौ तद्व्यपदेशात् ।

5. Sri Ramanuja thus beautifully describes *sankalpa* प्रकृत्या तद्गुणैश्चात्मानमेकीकृत्यानुसंधानं सङ्कल्पः ।

त्यक्त्वा कर्मफलासङ्गं नित्यतृप्तो निराश्रयः ।
कर्मण्यभिप्रवृत्तोऽपि नैव किंचित्करोति सः ॥ २० ॥

Having abandoned clinging to the fruits of actions, full of eternal contentment and not dependent on anything else, though engaged in doing action, he does not do anything

NOTES.

1. He does his work to help the world or to prevent censure by the pure. He is contented and self-dependent.

2 When work blossoms into worship and worship fructifies into realisation, the bondage of work ceases.

निराशीर्यतचित्तात्मा त्यक्तसर्वपरिग्रहः ।
शारीरं केवलं कर्म कुर्वन्नाप्नोति किल्बिषम् ॥ २१ ॥

Without desireful expectation controlling the mind and the body and the senses, having relinquished all acqusitiveness, doing only such acts as are necessary to maintain the body, he does not commit any sin.

Notes

1 मनः, बुद्धि, चित्त, and अहंकार are aspects of mind They are reason determinative faculty memory and egoism

2. In the case of ascetics various abstentions are enjoined

मधु मांसं च मद्यं च ताम्बूलं तैलमौषधम् ।
अभ्यान्यद्वै यवद्धातपा कान्ता च कामनम् ॥

यदृच्छालाभसन्तुष्टो द्वन्द्वातीतो विमत्सरः ।
समः सिद्धावसिद्धौ च कृत्वापि न निबध्यते ॥ २२ ॥

Content with what is got without effort, unfettered by the pairs of opposite, free from envy and hate, even minded in attainment and non attainment—he though doing actions, is not bound thereby

Notes

1 The same idea is conveyed in the verse

अयाचितमयत्नलब्धमुपपन्नं यदृच्छया ।

2. Ascetics should have the minimum of possessions.

कौपीनयुगलं वासः कन्थां शीतनिवारिणीम् ।
पादुके चापि गृह्णीयात्कुर्यान्नान्यस्य संग्रहम् ॥

3. These verses give us the key to that power of transmutation by which actions lose their ironness of binding power and become the gold of bliss.

गतसङ्गस्य मुक्तस्य ज्ञानावस्थितचेतसः ।
यज्ञायाचरतः कर्म समग्रं प्रविलीयते ॥ २३ ॥

In the case of him from whom attachment has gone, who is liberated, whose mind is centred steadfastly in wisdom and who does work in a spirit of sacrificial offering to God, all action dissolves away.

NOTES.

1 The same idea is expressed in this verse also. These verses teach us the mystic secret of making actions the means of liberation

2. It is well said

न्यायागतधनस्तत्त्वज्ञाननिष्ठोऽतिथिप्रिय ।
श्राद्धकृत्सत्यवादी च गृहस्थोऽपि विमुच्यते ॥

ब्रह्मार्पणं ब्रह्म हविर्ब्रह्माग्नौ ब्रह्मणा हुतम् ।
ब्रह्मैव तेन गन्तव्यं ब्रह्मकर्मसमाधिना ॥ २४ ॥

The means of oblation is Brahman, the clarified butter offered is Brahman; the offering is by the priest who is Brahman in the fire which is

Brahman, the place of attainment is Brahman through the realisation of action as Brahman

NOTES

1 In the case of the wise who work for loka sangraha the realisation of God in everything is full and perfect and in their case *karma* is really *akarma*. This is what is called यथाक्रतुन्याय (the motive determines the fruit)

2. In him there will be no distinctions of desires or expectations, and no ideas of क्रिया, कारक and फल Such is ज्ञानयज्ञ.

3. The Vartikakara says well

कारकव्यवहारे हि शुद्ध वस्तु न वीक्ष्यते ।
शुद्ध वस्तुनि सिद्ध च कारकव्यापृतिः कुतः ॥

4 Sri Ramanuja, consistently with his philosophy explains the underlying idea thus ब्रह्मात्मकतया ब्रह्मभूतमात्मस्वरूपं गन्तव्यम् । मुमुक्षुणा क्रियमाणं कर्म परप्रब्रह्मात्मकमेवेत्यनुसंधानयुक्ततया ज्ञानाकारं साक्षादात्मावलोकनसाधनं ज्ञाननिष्ठाव्यवधानेनेत्यर्थः ।

5 Sri Madhva appropriately quotes the following verse from Padma Purana.

त्वदधीनं यतः सर्वमतः सर्वो भवानिति ।

6 The difference between the school of thought which says तत्सर्वं and that which says

तद्धर्मिणं is in relation to what the former calls the पराकाष्ठा. So far as the negation of egoism and the affirmation of bliss through realisation of God are concerned, both agree In the present verse it is the latter aspect that is stressed and we should not bring in discussions about the former

दैवमेवापरे यज्ञं योगिनः पर्युपासते ।
ब्रह्माग्नावपरे यज्ञं यज्ञेनैवोपजुह्वति ॥ २५ ॥

Some yogis perform sacrifices to the Devas (gods), others offer the self as sacrifice by the self alone in the fire of Brahman

NOTES

1. The former half refers to the performance of Darsapoornamasa, Jyotishtoma, and other sacrifices The latter refers to the realisation of the identity of soul and God through meditation Sri Sankara says

सोपाधिकस्यात्मनो निरुपाधिकेन परब्रह्मस्वरूपेणैव यद्दर्शनं स तस्मिन्होमः तं कुर्वन्ति ब्रह्मात्मैकत्वदर्शननिष्ठा इत्यर्थः ।

श्रोत्रादीनीन्द्रियाण्यन्ये संयमाग्निषु जुह्वति ।
शब्दादीन्विषयानन्ये इन्द्रियाग्निषु जुह्वति ॥ २६ ॥

Some offer as sacrifice the ears and other senses in the fires of self-control Others offer sound and other sense-objects in the fires of the senses.

NOTES.

1 संयम is धारणा, ध्यान and समाधि The Homa stated in the first half of the verse is perfecting प्रत्याहार into धारणा, ध्यान and समाधि

2 The *homa* (oblation) stated in the second half of the verse is the sensing of permitted things by excluding forbidden things Sri Sankara says.

श्रोत्रादिष्वविरुद्धविषयग्रहणं होमं मन्यन्ते ।

3. These are the gradations of self control resorted to so that we may become experts in self control which alone leads to the bliss of self realisation

4 That different forms of self control lead to different attainments is thus stated in the Yoga sutras: भुवनज्ञानं सूर्ये संयमात् चन्द्रे ताराव्यूहज्ञानं कण्ठकूपे क्षुत्पिपासानिवृत्तिः । If the ear is self controlled in the *Anahata Dhvani, Dasanadas* (10 sounds) are heard

सर्वाणीन्द्रियकर्माणि प्राणकर्माणि चापरे ।
आत्मसंयमयोगाग्नौ जुह्वति ज्ञानदीपिते ॥ २७ ॥

Some offer all the actions of the senses and of the vital energy as oblation in the fire of the yoga of self-control kindled and illumined by wisdom.

NOTES

1 The five jnanendriyas the five karmendriyas and the five vital energies and Manas and Buddhi

form the Linga Sarira The homa of this in Nirodha Samadhi means the absorption of it in the Atman

2 Sri Ramanuja says मनस इन्द्रियप्रवणतानिवारणे प्रयतन्त इत्यर्थ. ।

द्रव्ययज्ञास्तपोयज्ञा योगयज्ञास्तथापरे ।
स्वाध्यायज्ञानयज्ञाश्च यतयः संशितव्रताः ॥ २८ ॥

Some perform the sacrifice of wealth; some perform the sacrifice of austerity; others perform the austerity of Yoga; others perform the sacrifice of Vedic study; yet others perform the sacrifice of the investigation of the meaning of the Veda, others are practiced strivers who have perfected and fulfilled vows.

NOTES

1 द्रव्ययज्ञा· Those philanthropists who sink tanks, wells, etc , and form flower gardens etc. These acts of philanthrophy come under दत्त and पूर्त.

वापीकूपतटाकादिदेवतायतनानि च ।
अन्नप्रदानमाराम· पूर्तमित्यभिधीयते ॥

शरणागतसंत्राण भूतानां चाप्यहिंसनम् ।
बहिर्वेदि च यद्दानं दत्तमित्याभिधीयते ॥

Sri Ramanuja says द्रव्ययज्ञाः न्यायतो द्रव्याण्युपादाय

द्रव्यार्जने प्रवर्तन्ते । (They got wealth by proper means and use it to worship God)

2. तपोयज्ञाः—Chapter XVII verses 14 to 16 describe the tapas of body speech and mind

3. योगयज्ञाः—This refers to the *Ashtanga Yoga*

4. संशितव्रताः—Refers to what are called *Maha vritas* in the Yoga Shastra The five *yamas* are ahimsa satya asteya brahmacharya and aparigraha. If these are practised at all times in all places and under all conditions they are called *Mahavratas* ते जातिदेशकालसमयानवच्छिन्नाः सार्वभौमा महाव्रतम् । Only in this way can Kama Krodha Lobha and Moha be triumphantly and finally overcome. Sri Madhusoodana says
तत्राहिंसया क्षमया क्रोधस्य ब्रह्मचर्येण वस्तुविचारेण कामस्य, अस्तेयापरिग्रहाभ्यां सन्तोषेण लोभस्य, सत्येन यथार्थज्ञानरूपेण विवेकेन मोहस्य सम्यगेव सर्वेषां निवृत्तिरिति द्रष्टव्यम् ।

अपाने जुह्वति प्राणं प्राणेऽपानं तथाऽपरे ।
प्राणापानगती रुद्ध्वा प्राणायामपरायणाः ॥ २९ ॥

Others offer as sacrifice the outgoing breath in the incoming breath and the incoming breath in the outgoing breath, thus stopping the courses of the intaken and outgoing breaths and devoted to the performance of Pranayama.

NOTES·

1. This stanza refers to पूरक, रेचक, and कुम्भक

2 Patanjali says in Yoga sutras
तस्मिन्सति श्वासप्रश्वासयोर्गतिविच्छेदलक्षण प्राणायाम ।

3 The spiritual science of Pranayama is dealt with at greater length in Chapter VI of the Gita

4 Pranayama enables the *yogi* to regulate and control and restrain the flow of vital energy, leads to concentration of mind, and results in prolongation of life The transference of breathing from the realm of involuntary action to the realm of voluntary action is one of the most powerful means of enabling the mind to gain in steadiness and vision and power It leads to enfranchisement from desire and the self-direction of the mind towards God

अपरे नियताहारा: प्राणान्प्राणेषु जुह्वति ।
सर्वेऽप्येते यज्ञविदो यज्ञक्षपितकल्मषा. ॥ ३० ॥

Others who take food in measure perform the sacrifice of Pranas in Pranas All these are knowers of sacrifice and are men whose sins have been destroyed by sacrifice.

NOTES

1. नियताहारा: In Chapter VI of the Gita the Lord says that measure in food and sleep and work

and rest is essential to Yoga (See verse 16 17) It is further said

द्वौ भागौ पूरयेदन्नैस्तोयेनैकं प्रपूरयेत् ।
मारुतस्य प्रचारार्थं चतुर्थमवशेषयेत् ॥

2. प्राणान्प्राणेषु जुह्वति—Sri Sankaracharya says that the transmutation of uncontrolled breath into controlled breath is itself described here as a *homa* or sacrifice.

3 Nilakanta says that the above words refer to the लय of the senses in the mind (manas) of the *manas* in the *chitta* and of the *chitta* in the *ahamkara*

4 Madhusoodana says that the above refers to a fourth Pranayama or केवल कुम्भक *i.e.*, the attainment of suspended breath and *Samadhi* without going through रेचक or पूरक—in which all the Indriyas are controlled and are in a condition of लय

5 Sridhara quotes in this connection two beautiful verses

हकारेण बहिर्याति सकारेण विशेत्पुनः ।
प्राणास्तत्र स एवाहं हंस इत्यनुचिन्तयेत् ॥

यथा यथा सदाभ्यासान्मनसः स्थिरता भवेत् ।
वायुवाक्कायदृष्टीनां स्थिरता च तथा तथा ॥

6 The Sruti declares

यच्छेद्वाङ्मनसी प्राज्ञस्तद्यच्छेज्ज्ञान आत्मनि ॥

7 Sri Madhavacharya quotes the following verse:

यदस्याल्पाशनं तेन प्राणाः प्राणेषु वै हुताः ॥

यज्ञशिष्टामृतभुजो यान्ति ब्रह्म सनातनम् ।
नायं लोकोऽस्त्ययज्ञस्य कुतोऽन्यः कुरुसत्तम ॥३१॥

Those who partake of the ambrosial food which forms the sacrificial remains attains the Eternal Brahma. Even this world is not for the non-performer of yajna; how then the other, O best of the Kuru line?

NOTES

1. The above-said sacrifices lead to God through purity of mind (*chitta suddhi*)

2 Neelakanta thinks that the yajnas refer to the daily five *yajnas* (देवऋषिपितृभूतातिथियज्ञ)

3 अयं लोकः Sri Ramanujacharya well explains this as meaning this Prakrita loka with Dharma, Artha, and Kama The परलोक is Moksha. नायं लोकः न प्राकृतलोक. प्राकृतलोकसंबन्धि धर्मार्थकामाख्य. पुरुषार्थो न सिध्यति कुत इतोऽन्यो मोक्षाख्यः पुरुषार्थः । परमपुरुषार्थतया मोक्षस्य प्रस्तुतत्वात्तदितरपुरुषार्थोऽय लोक इति निर्दिश्यते स हि प्राकृतः ।

एवं बहुविधा यज्ञा वितता ब्रह्मणो मुखे ।
कर्मजान्विद्धि तान्सर्वानेवं ज्ञात्वा विमोक्ष्यसे ॥ ३२ ॥

Thus sacrifices of various forms are elaborated in the Vedas. Know that all of them are the effects of action (physical, verbal, and mental). Knowing this, thou shalt attain liberation.

NOTES

1. Sacrifices are thus the means and not the end or the goal. The Atman is Eternal Peace and Love and Joy. They lead to a realisation of the true nature of the Atman through Sattvajnana. अयज्ञो वा एष पुरुषः अयज्ञो न हि यज्ञः (Sruti.)

2. In the Paisacha Bhashya by Hanuman it is well said. एते यज्ञाः परमात्मनः प्राप्तिसाधनभूताः ।

श्रेयान्द्रव्यमयाद्यज्ञाज्ज्ञानयज्ञः परंतप ।
सर्वं कर्माखिलं पार्थ ज्ञाने परिसमाप्यते ॥ ३३ ॥

O Parantapa, the sacrifice taking the form of wisdom is more auspicious than sacrifice of wealth and other material things. All action in its entirety, O Partha, attains its fulfilment and consummation in wisdom.

NOTES

1 Karmas lead to fruits, wisdom is not causal but only revelatory

2 Sri Ramanujacharya thinks that in this verse the Jnana element in Karma Yoga is shown to be higher than the mere Karma element in it

3. True work is that which leads to worship and wisdom

तद्विद्धि प्रणिपातेन परिप्रश्नेन सेवया ।
उपदेक्ष्यन्ति ते ज्ञानं ज्ञानिनस्तत्त्वदर्शिनः ॥ ३४ ॥

Know thou this by prostrating thyself and by frequent questions and by service The wise who have realised the Truth will then impart wisdom to you.

NOTES

1 Reverence, interrogation, and service—all are required in the pupil In the teacher wisdom and realisation are required Else instruction has no fruitfulness उक्तज्ञानाद्भवेत्कार्यं नान्यैरिति हरेर्मतम् ॥

2 The pupil must interrogate about spiritual matters. The whole framework of the *Kenopanishad* shows thus A beautiful Stanza says

कथं बन्धः कथं मोक्षः कस्य केन विमुच्यते ।
विद्याविद्ये कथं भूते कोऽहं दृश्यमिदं च किम् ॥

3. The Sruti says तद्विज्ञानार्थं स गुरुमेवाभिगच्छेत्समित्पाणिः श्रोत्रियं ब्रह्मनिष्ठम् ।

4 The quickening of truth in us can be caused only by soul acting on soul

यज्ज्ञात्वा न पुनर्मोहमेवं यास्यसि पाण्डव ।
येन भूतान्यशेषेण द्रक्ष्यस्यात्मन्यथो मयि ॥ ३५ ॥

Having known that, you will not, O Pandava, again have any delusion as now By knowing that, you shall realise the entirety of creation in the Atman and then in Me

NOTES.

1 This shows that only through the discipli nes of wisdom can we attain self realisation and God realisation Sri Sankaracharya says that this means self realisation as identical with God. Sri Ramanujacharya says that it means the realisation of the true nature of all souls and their similarity to God Identity is emphasised by the former and equality by the latter Sri Ramanuja says that Jivas have ज्ञानाकारतया साम्य and भगवत्स्वरूपसाम्य Sri Sankara says that the verse refers to सर्वात्मैकत्वम् ।

अपि चेदसि पापेभ्यः सर्वेभ्यः पापकृत्तमः ।
सर्वं ज्ञानप्लवेनैव वृजिनं सन्तरिष्यसि ॥ ३६ ॥

Even if you are the most sinful of all sinners, you can cross all sin with the raft of wisdom.

NOTES:

1. *Papa* (sin) includes all karmic bondage the bondage of Dharma and Adharma Sri Sankaracharya says धर्मोऽपीह मुमुक्षोः पापमुच्यते ।

2 Wisdom is the supreme purifier and burns up all Karmic taint

यथैधांसि समिद्धोऽग्निर्भस्मसात्कुरुतेऽर्जुन ।
ज्ञानाग्निः सर्वकर्माणि भस्मसात्कुरुते तथा ॥ ३७ ॥

As the well-lighted fire reduces all wood to ashes, even so does the fire of wisdom reduce all actions to ashes.

NOTES:

1 Jnana burns up all *Sanchita* (acumulated and *Agami* (future) *karmas* *Prarabdha* (that fragment of our *karmic* sum total which has begun to bear fruit) alone must be worked out The Brahmasutras say

तदधिगम उत्तरापूर्वाघयोरश्लेषविनाशौ तद्व्यपदेशात् ।
इतरस्याप्येवमसंश्लेषः पाते तु । भोगेन त्वितरे क्षपयित्वा संपद्यते ।

2 The Sruti says

तस्य तावदेव चिरं यावन्न विमोक्ष्येऽथ संपत्स्ये ।

भिद्यते हृदयग्रन्थिश्छिद्यन्ते सर्वसंशयाः ।
क्षीयन्ते चास्य कर्माणि तस्मिन्दृष्टे परावरे ॥

तद्यथा पुष्करपलाश आपो न श्लिष्यन्त
एवमेवंविदि पापं कर्म न श्लिष्यते ।
तद्यथेषीकातूलमग्नौ प्रोतं प्रदूयेत
एवं हास्य सर्वे पाप्मानः प्रदूयन्ते ॥

4 There are also *adhikari purushas* who as the result of *upasanas* are, though of attained wisdom, bound by the Eternal Will to the fulfilment and discharge of certain cosmic offices and functions. "यावदधिकारमवस्थितिराधिकारिकाणाम्" (say the Brahma Sutras.)

न हि ज्ञानेन सदृशं पवित्रमिह विद्यते ।
तत्स्वयं योगसंसिद्धः कालेनात्मनि विन्दति ॥

Verily there is in this world nothing equal to wisdom as a purifier. Therefore in due time he who is perfected in Yoga realises and attains It in the self.

NOTES.

1 By karma alone karma cannot be overcome
कर्मणा कर्मनिर्हारो नैकान्तिक इष्यते ।

Yogasamsiddha means perfected through karma yoga and samadhi yoga (Sri Sankaracharya). Sri Ramanujacharya thinks that it means karma yoga.

श्रद्धावाँल्लभते ज्ञानं तत्परः संयतेन्द्रियः ।
ज्ञानं लब्ध्वा परां शान्तिमचिरेणाधिगच्छति ॥३९॥

The man who is full of faith, who is devoted to it, and who is of controlled senses attains wisdom; and having attained wisdom, he will attain soon the supreme peace.

NOTES

1 अचिरेण i e soon This means 'at the end of Prarabdhakarma" (action which has begun to bear fruit).

2 As a light dispels darkness of its own power and not with other aid, so doth wisdom dispel karmic bondage.

3. Faith is esential अस्तीत्येवोपलब्धव्य

4 Wisdom alone effects liberation The Sruti says

ब्रह्मविदाप्नोति पर ।
ज्ञात्वा देवं मुच्यते सर्वपाशै ।
ज्ञात्वा शिव शान्तिमत्यन्तमेति ।
तमेवं विदित्वातिमृत्युमेति ।
य एतद्विदुरमृतास्ते भवन्ति ।

अज्ञश्चाश्रद्दधानश्च संशयात्मा विनश्यति ।
नायं लोकोऽस्ति न परो न सुखं संशयात्मनः ॥ ४० ॥

The ignorant man, the man who has not faith, and the man who is full of doubt each of these goes to destruction neither this world nor the next nor joy comes to the man of doubt

NOTES

1 The ignorant man can be easily saved the man of unfaith can be saved with some difficulty but the man of hopeless perversity of doubt is very difficult to save. Neelakantha says well. अज्ञः सुखेन प्रतिबोधयितुं शक्यः । अश्रद्दधानो यत्नेन, संशयात्मा त्वसाध्य एव ।

2 The doubting man is the agnostic He is generally a cynic a misanthrope and a sufferer rolled into one He is a universal and unhesitating hesitator He will not trust even his friends and hence will not get the blessings of this world He will not trust Scripture and will not hence get the blessings of the other world He will not trust even his food and will lose all pleasure. The man of ignorance and the man of unfaith will at least have this world and its pleasures though not the other world

3 Thus while he cannot get even धर्मार्थकाम, what chance is there of his attaining Moksha?

योगसंन्यस्तकर्माणं ज्ञानसंछिन्नसंशयम् ।
आत्मवन्तं न कर्माणि निबध्नन्ति धनंजय ॥ ४१ ॥

O Dhananjaya, actions do not bind him who has attained renunciation of work through Yoga, who has destroyed doubt through wisdom, and who is ever vigilant.

NOTES.

1 योगसंन्यस्तकर्माणं Who has come out of the bondage of Karma by making work a love-offering to God realising the Truth about eternal and non-eternal things

2 There is nothing higher than Self-Realisation The Sruti says आत्मलाभान्न परं विद्यते ।

तस्मादज्ञानसंभूतं हृत्स्थं ज्ञानासिनात्मनः ।
छित्त्वैनं संशयं योगमातिष्ठोत्तिष्ठ भारत ॥ ४२ ॥

Therefore, cleaving asunder with the sword of wisdom the doubt born of ignorance and seated in the heart, be established in Yoga. Arise O Bharata

NOTES

1 The simile is a military simile It is addressed to a warrior The clarion call to him at the end is, arise and march, O Soldier of God, under His Divine command

2. *Arise* Arise and take up thy duty in the true *Karmayogi's* spirit Thy present duty is to fight.

GENERAL CONCLUDING REMARKS

1 The fourth chapter of the Gita is called ज्ञानकर्मसंन्यासयोग In it the Lord tells us the secret of *avataras* the innermost truths of Karma yoga the various forms of Karma yoga the need for knowledge faith and self control and the supreme power of *jnana* (wisdom) Yamunacharya s Gitarthasangraha says well.

प्रसङ्गात्स्वस्वभावोक्तिः कर्मणोऽकर्मतास्य च ।
भेदा ज्ञानस्य माहात्म्यं चतुर्थाध्याय उच्यते ॥

2 Sri Madhusoodana says

समानीतस्वपापेन माक्षिप्य दर्शिते ।
योऽरेतु कर्मनिष्ठा च हरिणोपसंहृता ॥

Thus ends the Chapter
KARMA BRAHMARPANA YOGA.

CHAPTER V

Karma Sannyasa Yoga.

Preliminary Observations

1 As the Lord has taught both Karma Yoga and Karma Sanyasa, Arjuna asks which is the better of the two, and with that question the fifth chapter begins

2 Till now Karma yoga was taught and explained The Lord is going to show that it is the best means of spiritual realisation Till renunciation is attained in full, work must be done in the spirit of the true *Karma yogi* When the spirit of renunciation comes, to steady and perfect it a man may give up works and devote all time to *Samadhi yoga*. We must not prematurely take up the latter or waver between the two Madhusoodana says

तस्मादादौ भगवदर्पणबुद्ध्या निष्कामकर्मानुष्ठानादन्तःकरणशुद्धौ तीव्रेण वैराग्येण विविदिषायां दृढायां सर्वकर्मसंन्यास श्रवणमननादिरूपवेदान्त-वाक्यविचाराय कर्तव्य इति भगवतो मतम् ।

3. A beautiful stanza says

कषायपक्ति कर्मभ्यो ज्ञानं तु परमा गतिः ।
कषाये कर्मभिः पक्के ततो ज्ञानं प्रवर्तते ॥

The Vartikakara says

प्रव्रज्यादृष्टात्सिद्धं यदा तु वचनाद्ध्रुवः ।
यदहरेव तु तत्यागमीप्सन्तीति श्रुतेर्वचात् ॥

The Sruti says about renunciation —

ब्रह्मचर्यं समाप्य गृही भवेद्गृहाद्वनी भूत्वा प्रव्रजेत् यदि वेतरथा ब्रह्मचर्यादेव प्रव्रजेद्गृहाद्वा वनाद्वा यदहरेव विरजेत्तदहरेव प्रव्रजेत् ।

4 Sri Ramanujacharya develops his doctrine thus. In the 3rd chapter Karma yoga was taught. In the 4th chapter the superiority of the jnana element in Karma yoga was stressed. In this chapter the importance of jnananishtha in Karma yoga for leading to a realisation of the true nature of the jiva (as apart from God) is shown. He says. चतुर्थेऽध्याये कर्मयोगस्य ज्ञानाकारतापूर्वकस्वरूपभेदो ज्ञानांशस्य च प्राधान्यमुक्तम् । ज्ञानयोगाधिकारिणोऽपि कर्मयोगस्यान्तर्गतात्मज्ञानत्वादप्रमादत्वात्सुकरत्वान्निरपेक्षत्वाच्च ज्यायस्त्वं तृतीय एवोक्तम् । इदानीं कर्मयोगस्यात्मप्राप्तिसाधनत्वे ज्ञाननिष्ठायाः शैघ्र्यं कर्मयोगान्तर्गताकर्तृत्वानुसंधानप्रकारं च प्रतिपाद्य तन्मूलं ज्ञानं च विशोध्यते ।

5 Sri Madhvacharya says that this chapter develops the Karma yoga taught in Chapter III. तृतीयाध्यायेनोक्तमेव कर्मयोगं प्रपञ्चयत्यनेनाध्यायेन ।

6 This chapter is called कर्मसंन्यासयोग ।

7 It seems to me that the central truth is that Karma yoga should be performed with an increas

ing realisation of the Eternal Truth, till at last the realisation remains and work falls off, just as in a tree the blossom shines forth till at last the fruit appears and the blossom is shed न कर्माणि त्यजेद्योगी कर्मभिस्त्यज्यते ह्यसौ। We must not be carried away by technical differences of doctrine Making allowance for the verbal differences we must see the real and essential oneness of doctrine and accept it and act on it.

अर्जुन उवाच

संन्यासं कर्मणां कृष्ण पुनर्योगं च शंससि ।
यच्छ्रेय एतयोरेकं तन्मे ब्रूहि सुनिश्चितम् ॥ १ ॥

Arjuna said

Thou praisest renunciation of action as well as the performance of action, O Krishna Tell me decisively which is the more auspicious of the two.

NOTES

1 Sri Sankaracharya points out that the choice is as between कर्मयोग and कर्मसंन्यास in the case of one who has not attained realisation In the case of him who has attained realisation there is no scope for Karma as he has attained cosmic consciousness.

2 कृष्ण He is so called because he is पापकर्षण, भक्तदुःखकर्षण, सदानन्दरूप । (the destroyer of sins and sorrows and the giver of bliss)

न कर्मणामनारम्भान्नैष्कर्म्यं पुरुषोऽश्नुते ।
न च संन्यसनादेव सिद्धिं समधिगच्छति ॥

श्रीभगवानुवाच

सन्यासः कर्मयोगश्च निःश्रेयसकरावुभौ ।
तयोस्तु कर्मसंन्यासात्कर्मयोगो विशिष्यते ॥ २ ॥

The Blessed Bhagavan said

Sannyasa (renunciation of action) and Karma Yoga both lead to bliss But of the two Karma Yoga is better than Karma Sannyasa

NOTES

1 The Lord has made himself quite clear here and I fail to see how there can be any possible controversy about His meaning कर्मयोग leads easily through *chittasuddhi* to *jnana* and to *Moksha.*

2 Karmayoga has got in its favour सौकर्य (its being easy), शैघ्र्य (its being quick in fructification) and अनपाय (its not being dangerous)

ज्ञेयः स नित्यसंन्यासी यो न द्वेष्टि न काङ्क्षति ।
निर्द्वन्द्वो हि महाबाहो सुखं बन्धात्प्रमुच्यते ॥ ३ ॥

He (the Karmayogi) should be known as the *Nitya Sannyasi* (the perpetual renouncer) who does not hate or desire; for he is free from

the *dvandvas* (the pairs of opposites), O mighty armed ! and is easily set free from bondage

NOTES

1 The true Karma *Yogi* is better than the unfit or false *Sannyasi* But the true Karma Yogi and the true Sannyasi have and reach the same goal. Even as between them the former has an easier and quicker and less dangerous path

2. The *dvandvas* i.e heat and cold joy and pain etc

साङ्ख्ययोगौ पृथग्बालाः प्रवदन्ति न पण्डिताः ।
एकमप्यास्थितः सम्यगुभयोर्विन्दते फलम् ॥ ४ ॥

Children, not sages, called *Samkhya* and *Yoga* as separate and diverse If one is rooted in either he gets the fruit of both

NOTES.

1 How can any one have doubts or disputes after such a declaration ? There is फलैक्य (sameness of result)

2. Nilakanta says that this verse dispels the following doubt. In Karma Sanyasa there is fear of defection (पातभय) and in Karma Yoga there is the burden of work (श्रमभय) Which is the better of the two? The Lord says that both have the same fruit

3 The फल is stated by Sri Ramanujacharya as *Atmavalokana* (realisation of the Self)

यत्सांख्यैः प्राप्यते स्थानं तद्योगैरपि गम्यते ।
एकं सांख्यं च योगं च यः पश्यति स पश्यति ॥ ५ ॥

The attainment reached by the *Samkhyas* is reached by the *Yogins* as well. He sees well who sees *Samkhya* and *Yoga* as one

NOTES

1 The same idea is elaborated in this verse

2 Karma Yoga leads to ज्ञाननिष्ठा It has been well said यान्यतोऽन्यानि जन्मानि तेषु नून कृत भवेत् ।
सत्कुल्य पुरुषेणेह नान्यथा ब्रह्मणि स्थितिः ॥

संन्यासस्तु महाबाहो दुःखमाप्तुमयोगतः ।
योगयुक्तो मुनिर्ब्रह्म न चिरेणाधिगच्छति ॥ ६ ॥

Renunciation of work, O mighty-armed ! is difficult to attain without Yoga The man of Yoga who is full of devotion attains Brahman soon.

NOTES

1 योगयुक्तः Sri Sankaracharya thus explains its meaning well. वैदिकेन कर्मयोगेनेश्वरसमर्पितेन फलनिरपेक्षेण युक्तः। (Having the scriptural Karma Yoga, dedicated to God and unexpectant of fruits).

2. The Sruti says शान्तो दान्त उपरतस्तितिक्षुः समाहितो भूत्वात्मन्येवात्मान पश्यति ।

3. The following verses thus describe well this *Sadhana*.

पिण्डीकृत्य ह्ययमाम पुद्गावारोप्य नियमम् ।
विनयाश्चतस्रधीरस्थाता स्थिरधियश्चरापत ॥
एषाऽभ्युपाय सर्वत्र वेदान्तेषु प्रतिष्ठितः ।
तत्त्वमस्यादिवाक्यार्थज्ञानोत्पत्त्यर्थमादरात् ॥

4. If an unfit man prematurely performs कर्मसन्न्यास he becomes कर्मब्रह्मोभयभ्रष्ट i.e. one who has lapsed from Karma and Brahma. Hence Karma Yoga is the easier and surer and better path.

5. The real question is, what is the force of the वैराग्य? Do you feel such *Vairagya* that during all waking moments you are prepared to spend all your time—till death arrives—in study and meditation? Then the path of विविदिषासन्न्यास may be taken. Yet pause and hesitate before you take the plunge. The path is difficult. The path of Karma Yoga has got a real and growing element of *Sannyasa* and is the easier and surer path and leads to the same goal. Venkatanatha the author of 'Brahmanandagiri says: सदेवास्य तीव्रतरे वैराग्ये सन्यास, तदभावे कर्मयोग इति व्यवस्थायामनयोः कोऽपि विरोधः ॥

6. Sri Ramanujacharya says that संन्यास means Jnana Yoga and that Karma Yoga is better and easier and surer than Jnana Yoga in leading us

to Atmasakshatkara (Self-realisation). According to him it is after this that Bhakti leads us to Bhagavatsakshatkara (God-realisation).

योगयुक्तो विशुद्धात्मा विजितात्मा जितेन्द्रियः ।
सर्वभूतात्मभूतात्मा कुर्वन्नपि न लिप्यते ॥ ७ ॥

He who has attained Yoga, whose mind is pure, who has conquered his body and his senses, and whose self has become the self of all creation is unaffected though he is doing work.

NOTES

1 The conquest of the body, the senses, and the mind is thus described by Manu

वाग्दण्डोऽथ मनोदण्डः कायदण्डस्तथैव च ।
यस्यैते नियता दण्डाः स त्रिदण्डीति कथ्यते ॥

2 He is not affected by Karma as he does work only for *Lokasangraha*

3 सर्वभूतात्मभूतात्मा Sri Sankaracharya says that this refers to the identity of souls; Sri Ramanujacharya says that this refers to the equality of souls (as all souls are equal in jnana, only the material bodies being different); Sri Madhvacharya finds herein the similarity of souls as servants or images of God, though souls are diverse and unequal. This is the only and fundamental difference

between the three schools of thought They agree in the *Sadhanas* and in Atma being Sachchidananda and immaterial and eternal The solution of the aforesaid only difference is only by each seeing for himself the fact at the end of the common road. I do not propose to discuss the relative merits and demerits of these diverse and different views. They have been discussed for centuries and they will be discussed for centuries more. The common road is untrod and we only get into lanes and discuss the goal in excited groups. I do not propose to go into that question

> नैव किंचित्करोमीति युक्तो मन्येत तत्त्ववित्।
> पश्यञ्शृण्वन्स्पृशञ्जिघ्रन्नश्नन्गच्छन्स्वपञ्श्वसन् ॥ ८॥
>
> प्रलपन्विसृजन्गृह्णन्नुन्मिषन्निमिषन्नपि।
> इन्द्रियाणीन्द्रियार्थेषु वर्तन्त इति धारयन् ॥ ९॥

The knower of truth must think with his calm and composed mind that he is not himself engaged in any activity—whether seeing hearing touching, smelling eating, going sleeping, breathing, speaking, discharging, receiving opening and closing the eyes,—realising that (in these acts) the senses are moving among the sense objects.

NOTES

1 The Advaita school says that this is because the soul is not an actor but is Sachchidananda The Dvaita school says that this is because the true doer as God and man must give up his false idea of independent volition

2 The Lord has summed up in this verse the work of the five *Jnanendriyas* and the five *Karmendriyas*

The soul is not the actor and director in respect of either voluntary or involuntary or reflex actions in the body By mere mental *adhyasa* it has imposed on itself the idea of being a doer in regard to the voluntary actions alone The true seer will have the same attitude towards voluntary actions as we have towards involuntary and reflex actions

ब्रह्मण्याधाय कर्माणि सङ्गं त्यक्त्वा करोति यः ।
लिप्यते न स पापेन पद्मपत्रमिवाम्भसा ॥ १० ॥

He who performs actions, surrendering them unto God and giving up attachment, is untouched and untainted by sin just as a lotus leaf is unaffected by the water

NOTES

1. "Brahma" in this stanza is taken by Sri

Sankaracharya and Sri Madhvacharya as meaning God Sri Ramanujacharya takes it as meaning Prakriti. As everything emanates from Brahman, Prakriti being only the primary emanation or *sakti* this process of realising our detachedness and our true nature and realising that the sense-actions are really not a portion of our very Self is the same whether we regard them as the effect of Prakriti (a nearer cause) or as the result of God's *sankalpa* (the ultimate cause)

2. The previous two verses refer to the *Jnana yoga* This verse refers to the *Karma yoga*

कायेन मनसा बुद्ध्या केवलैरिन्द्रियैरपि।
योगिनः कर्म कुर्वन्ति सङ्गं त्यक्त्वात्मशुद्धये ॥ ११ ॥

The (karma) yogins perform action—renouncing attachment and for the sake of mental purity—with their body and mind and senses which are freed from the sense of possession and pleasure and full of the sense of surrender of all fruits to God

NOTES.

1 The word केवल has been explained above by a long phrase to bring out its full force as pointed out by Sri Sankaracharya

2 The purified mind, as pointed out in the Bhashyotkarsha Deepika, will rejoice in meditation and selfless aid to others. The purified ears will rejoice in hearing about His love and His blessed actions for the good of humanity The purified tongue will take what had been offered in His worship The purified nose will rejoice in the smell of flowers placed in worship at His lotus feet The purified skin will rejoice in His divinest streams. The purified feet will seek His shrines The purified hands will worship Him The purified tongue will utter in gladness His praise and sing His glory

3 Such holy actions bless not only the doer but also those who follow or applaud them or merely report them or look on them

धर्मः श्रुतो वा दृष्टो वा कथितो वा कृतोऽपि वा ।
अनुमोदितो वा राजेन्द्र पुनाति पुरुषं सदा ॥

(Mahabharata Asvamedha parva, chapter 94 verse 29)

युक्तः कर्मफलं त्यक्त्वा शान्तिमाप्नोति नैष्ठिकीम् ।
अयुक्तः कामकारेण फले सक्तो निबध्यते ॥ १२ ॥

The dedicator of fruits of actions to God by giving up such fruits attains the peace born of such steadfastness (of karma yoga). The man

of unpoised mind is bound, because of its acting under desire and of its attachment to fruits

NOTES

1 The diversity of results of actions is due to the diversity of mental attitudes.

2. Sri Ramanujacharya takes the goal indicated by these verses to be the realisation of Jiva. According to him, as pointed out already the Gita leaves the soul at the end of the VIth chapter in a state of the realisation of the self attained by Karma yoga and Jnana yoga and then teaches the fitted soul the bliss of Bhakti yoga

सर्वकर्माणि मनसा संन्यस्यास्ते सुखं वशी ।
नवद्वारे पुरे देही नैव कुर्वन्न कारयन् ॥ १३ ॥

Renouncing mentally all actions, the man of controlled senses dwells, neither doing nor directing action—in the city of the nine gates.

NOTES

1 The city of the nine gates is the body which has nine openings. Neelakanta says that the nine gates are the five *Jnanendriyas*, *Prana*, *Buddhi*, *Ahankara*, and *Chitta*

2. Sri Sankaracharya says that after pointing out that to one who has not attained perfect mental

self-poise and purity the path of Karma Yoga is far better than the path of premature Karma Sannyasa (Vividisha Sannyasa), the Lord declares here that the man of attained self-poise and purity will be a *Jnananishtha* and rooted in *Vidvat Sannyasa.*

3 The other schools especially the Dvaita school say that what is taught is not the renunciation of action but the renunciation of passion.

4 सर्वकर्माणि means all actions including Nitya, Naimittika, Kamya, and *Pratishiddha*

5 Sri Ramanujacharya says well. आत्मनः प्राचीनकर्ममूलदेहसम्बन्धप्रयुक्तमिदं कर्मणां कर्तृत्वं न स्वरूपप्रयुक्तम् ।

न कर्तृत्वं न कर्माणि लोकस्य सृजति प्रभुः ।
न कर्मफलसंयोगं स्वभावस्तु प्रवर्तते ॥ १४ ॥

The Lord does not, in the case of beings, create doership or action or union with the fruit of action. This is done by Svabhava

NOTES ·

1. Sri Ramanujacharya takes प्रभु as meaning *jiva*—consistently with his interpretation of Chapter I to VI as pointed out already

2 *Svabhava.* This is a word about which controversy has raged Sri Sankaracharya takes it to mean Avidya or Maya or Prakriti Sri Rama-

nujacharya takes it to mean as the sum total of Jivas. Sri Madhvacharya takes it to mean God.

नादत्ते कस्यचित्पापं न चैव सुकृतं विभुः ।
अज्ञानेनावृतं ज्ञानं तेन मुह्यन्ति जन्तवः ॥ १५ ॥

The Lord doth not accept the good or the evil deeds of any person. Knowledge is veiled by ignorance and hence the mortals are deluded by ignorance.

NOTES

1. The Lord is *avapta samastakama* (perfection of bliss) and cannot be affected by the actions of created beings. These actions are in proportion to the predominance of ignorance or vision.

2. Sri Ramanujacharya takes प्रभु to mean jiva. Then the verse would mean that the jiva is in all bodies but is unaffected by good or bad actions which are proportioned to the mental states. He takes *ajnana* to mean Vasanas.

3. जन्तवः So called as they are जननशीलाः (given to successive births)

ज्ञानेन तु तदज्ञानं येषां नाशितमात्मनः ।
तेषामादित्यवज्ज्ञानं प्रकाशयति तत्परम् ॥ १६ ॥

But in the case of those in whom such ig-

norance has been destroyed by jnana (knowledge) their knowledge, like the Sun, reveals the Supreme.

NOTES.

1 The word "Atmanah" is in the singular number. It cannot be made the foundation for a discussion about the soul being one or many. But somehow that discussion is dragged in by some commentators Sri Madhvacharya takes "Atmanah" to mean God and to relate to ज्ञान So according to him आत्मनः ज्ञानेन could be by the knowledge of God.

2 Another discussion is about *avidya* being भावरूप (positive) or अभावरूप (negative)

3 Another discussion is whether jnana itself gives salvation or whether grace is necessary In fact, even jnana is due to grace. He who is able to say that the final factor is only this or that or something else would indeed be a bold man In my view these discussions do not really arise under this verse, though they may arise elsewhere

तद्बुद्धयस्तदात्मानस्तन्निष्ठास्तत्परायणाः ।
गच्छन्त्यपुनरावृत्तिं ज्ञाननिर्धूतकल्मषाः ॥ १७ ॥

Those whose minds have reached the supreme knowledge, whose self is the Supreme,

who are rooted in the Supreme, and to whom the Supreme is the highest attainment—they go to the abode whence there is no return, their sins having been destroyed by *jnana* (wisdom or realisation)

Notes

1 Between *Sravana* (study) and *Sakshatkara* (realisation) we have the indispensable and vital steps—*manana* and *Nididhyasana* (concentrated thought and meditation)

2 The four words तद्बुद्धय etc., mean four different and successive stages of attainment.

3 Sri Ramanuja consistently with his exposition of Chapters I to VI says that this verse describes the realisation of the nature of the soul (as different from the Oversoul)

विद्याविनयसंपन्ने ब्राह्मणे गवि हस्तिनि ।
शुनि चैव श्वपाके च पण्डिताः समदर्शिनः ॥ १८ ॥

The knowers of the Self look with an equal eye on a Brahmana endowed with wisdom and tranquillity, a cow, an elephant, a dog, and a *chandala*.

Notes

1. The above instances are given as illustrations of sattva rajas and tamas.

2 Sri Desikar says that *Vidya vinaya sampanna* does not qualify *Brahmana* but refers to a separate group while *Brahmana* refers to one who is a Brahmin by birth

3. The main idea is that the man of realisation beholds God in all

4 Sri Ramanuja says that diversity is in prakriti but not in the souls which have *samya* (likeness)

इहैव तैर्जितः सर्गो येषां साम्ये स्थितं मनः।
निर्दोषं हि समं ब्रह्म तस्माद्ब्रह्मणि ते स्थिताः॥ १९॥

Even here is *samsara* (the cycle of births and deaths) overthrown by those whose minds are rooted in this sameness Brahman is without any imperfection and is the same in all. Therefore they rest in Brahman.

NOTES

1. God is the all and the All-in-All.

2. His Love sustains and pervades and controls everything.

3 He is untouched by the imperfections of the manifested phenomena The Sruti says.

सूर्यो यथा सर्वलोकस्य चक्षुर्न लिप्यते चाक्षुषैर्बाह्यदोषैः।
एकस्तथा सर्वभूतान्तरात्मा न लिप्यते लोकदुःखेन बाह्यः॥

(Just as the sun who is the eye of the universe is untainted by outside imperfections even so is the universal Soul untainted by the griefs of the world)

4 The rule in Gautama Smriti "समासमाभ्यां विषमसमे पूजातः," which condemns equal reverence to the unequal and unequal reverence to the equal has no application to the seer of attained God realisation who sees God in all

न प्रहृष्येत्प्रियं प्राप्य नोद्विजेत्प्राप्य चाप्रियम् ।
स्थिरबुद्धिरसम्मूढो ब्रह्मविद्ब्रह्मणि स्थितः ॥ २० ॥

He whose mind is firm, who is without delusion, and who knows Brahman and rests in Brahman will not rejoice at attaining what is pleasant or grieve at receiving what is painful

NOTES.

1 The keynote of realisation is in the words *Viveka* and *vairagya* (wisdom and dispassion.)

बाह्यस्पर्शेष्वसक्तात्मा विन्दत्यात्मनि यत्सुखम् ।
स ब्रह्मयोगयुक्तात्मा सुखमक्षयमश्नुते ॥ २१ ॥

He whose mind is not attached to external objects attains the joy of the soul He, with his mind bound in union with Brahma, enjoys eternal and infinite bliss.

NOTES

1 Though one has been enjoying pleasures born of sense-contacts during many births yet renunciation will lead to a higher bliss

यच्च कामसुखं लोके यच्च दिव्यं महत्सुखम् ।
तृष्णाक्षयसुखस्यैते नार्हतः षोडशीं कलाम् ॥

The man of consummated Viveka and Vairagya attains the joy of the soul which is the joy of the union of the soul and the Oversoul.

3 Neelakanta says that Samadhi is like and unlike sleep like, because we have the bliss of ऐक्य (oneness) in both and unlike, because in the latter *avidya* (nescience) exists and the bliss is hence transient and interrupted while in the former avidya is destroyed and the bliss is eternal and perfect

ये हि संस्पर्शजा भोगा दुःखयोनय एव ते ।
आद्यन्तवन्तः कौन्तेय न तेषु रमते बुधः ॥ २२ ॥

All enjoyments that are contact-born are verily sources of pain. They have further a beginning and an end, O Kaunteya. Therefore the wise man rejoiceth not in them.

NOTES :

1 The bliss of God-love and God realisation is

eternal and perfect The pleasures of the senses are *brief and imperfect and lead to satiety and pain*

2. In all our pursuits of pleasure we have the pain of acquisition the pain of conservation the pain of decay and loss the inevitable satiety and the certainty that pleasure is bought at somebody else's pain Further all pleasures have a beginning and an end. As Gaudapadacharya says.

आदावन्ते च यन्नास्ति वर्तमानेऽपि तत्तथा ।

Such transiency is essential non-existence Further sense-pleasures often leave a craving which outlives the capacity to acquire or even to enjoy

3 All pleasures in earth or heaven are only pain to the seeker after the bliss of God realisation. Just as the eye is so delicate that what seems a gentle touch to the body is a rough and painful thing to it, even so the God lover who is the eye of the universe finds even the touch of sense-pleasures in heaven an agonising pain

4 The Yoga Bhashyakam here says well

सरस दुःखानुविद्धत्वेनाचतनधापचामनिसापाजुभव ॥

5 I may refer here to the wonderful Yoga sutras which have analysed the sources of sorrow

अविद्यास्मिता रागद्वेषाभिनिवेशाः पञ्चक्लेशाः ।

अविद्याक्षेत्रमुत्तरेषां प्रसुप्ततनुविच्छिन्नोदाराणाम् ॥

6. The Vishnu Purana says well

यावतः कुरुते जन्तुः संबन्धान्मनसः प्रियान् ।
तावन्तोऽस्य निखन्यन्ते हृदये शोकशङ्कवः ॥

शक्नोतीहैव यः सोढुं प्राक् शरीरविमोक्षणात् ।
कामक्रोधोद्भवं वेगं स युक्तः स सुखी नरः ॥ २३ ॥

That man who, even before his liberation from the body, can withstand and endure here on earth the force of lust and anger, is the man of *yoga*, the man of happiness.

NOTES

1. This self-control is due to a perception of the nature of the soul and the nature of the non-soul and leads to self-realisation.

2 Human life on earth is the place to learn this power of self-control which leads to the bliss of self-realisation.

3. The Yoga Vasishtha says well:

प्राणे गते यथा देहः सुखदुःखं न विन्दति ।
तथा चेत्प्राणयुक्तोऽपि स कैवल्याश्रमे वसेत् ॥

योऽन्तःसुखोऽन्तरारामस्तथान्तर्ज्योतिरेव यः ।
स योगी ब्रह्मनिर्वाणं ब्रह्मभूतोऽधिगच्छति ॥

The yogi full of inner happiness, inner

amusement, and inner illumination, having attained God, attains the Bliss Divine

NOTES

1 ब्रह्मभूतः The monistic school treats this as meaning having become one with Brahman Sri Madhva treats it as meaning one who is in Brahma (ब्रह्मणि भूतः)

2 Sri Ramanujacharya consistently with his general interpretation of Chapters I to VI of the *Gita* says that Brahmanirvana means the joy of realising the *jiva* (Atmanubhava sukham)

3 The difference between सुख and आराम is well brought out in the following verse in *Narada Purana.*

देहनिःसरणायासस्सुखं जायते नृणाम् ।
आरामः स तु विज्ञेयः सुखं कामक्षयोदितम् ॥

4. This verse gives us a glimpse into the joy of the self delighted and self illumined *yogi*

5 The Yoga Vasishta says well

न केचन जगद्भावास्तत्त्वज्ञं रञ्जयन्त्यमी ।
नागरं नागरीकान्तं कुग्रामललना इव ॥

लभन्ते ब्रह्मनिर्वाणमृषयः क्षीणकल्मषाः ।
छिन्नद्वैधा यतात्मानः सर्वभूतहिते रताः ॥ २५ ॥

The sages, with sins destroyed, with doubts dispelled, with senses controlled and with love for the good of all creatures attain the Bliss Divine.

NOTES

1 The Self is the Self of All and is the object of supreme love and affection and adoration The love of the men of right vision and renunciation flows out to all beings as they see the innermost unity of the Self of all. "तदेतत्प्रेयः पुत्रात्प्रेयो वित्तात्प्रेयोऽन्यस्मात्सर्वस्मादन्तरतरं यदयमात्मा" says the Sruti

2. Madhusoodana says that the sages attain freedm from sin by means of यज्ञ etc , abilty to realise the soul by means of purity of mind, victory over doubt by *Sravana* and *Manana* (hearing and thinking), steadfastness by *Nididhyasana*, (meditation) and love of all by God-realisation

कामक्रोधवियुक्तानां यतीनां यतचेतसाम् ।
अभितो ब्रह्मनिर्वाणं वर्तते विदितात्मनाम् ॥ २६ ॥

The Bliss Divine, both here and hereafter, is to those who are released from lust and anger, to the men of renunciation, to the men of controlled minds and to the men of realised Atman

NOTES:

1 अभितः is interpreted by Sri Sankaracharya as

meaning here and hereafter to show that a man may attain *Jivanmukti* even here [illegible] The other schools deny this. Sri Madhvacharya explains it as meaning always and everywhere and says that a man of realisation can see God everywhere and at all times

स्पर्शान्कृत्वा बहिर्बाह्यांश्चक्षुश्चैवान्तरे भ्रुवोः ।
प्राणापानौ समौ कृत्वा नासाभ्यन्तरचारिणौ ॥२७॥

यतेन्द्रियमनोबुद्धिर्मुनिर्मोक्षपरायणः ।
विगतेच्छाभयक्रोधो यः सदा मुक्त एव सः ॥२८॥

Shutting out all external contacts, with his gaze fixed between the eyebrows, making the outgoing and ingoing breaths equal and moving within the nostrils, with senses, mind and buddhi under control, with liberation as his supreme goal, freed from desire and fear and anger,—such a man of meditation is verily free for ever

NOTES

1 These two verses form the kernel (सूत्रस्थानीय) of Chapter VI

2 Viveka Vairagya, and Dhyana lead to Moksha

भोक्तारं यज्ञतपसां सर्वलोकमहेश्वरम् ।
सुहृदं सर्वभूतानां ज्ञात्वा मां शान्तिमृच्छति ॥२९॥

Having known Me who am the Enjoyer of all sacrifices and austerities, who am the Supreme Ruler of all the worlds, who am the Loving Friend of all beings, he attains peace.

NOTES

1 Sri Ramanujacharya says that the sage will do karmayoga as भगवदाराधनं । सुहृद आराधनाय हि सर्वे प्रयतन्ते ।

2 I cannot better conclude my notes on this chapter than by quoting the magnificent description of Bhagavan by Sri Sankaracharya in his Bhashya on this verse

भोक्तारं यज्ञानां तपसां च कर्तृरूपेण देवतारूपेण च सर्वलोकमहेश्वरं सर्वेषां लोकानां महान्तमीश्वरं सुहृदं सर्वभूतानां सर्वप्राणिनां प्रत्युपकारनिरपेक्षतयोपकारिणं सर्वभूतानां हृदयेशयं सर्वकर्मफलाध्यक्षं सर्वप्रत्ययसाक्षिणं मां नारायणं ज्ञात्वा शान्तिं सर्वसंसारोपरतिमृच्छति प्राप्नोतीति ।

CONCLUDING REMARKS

1 As already stated by me at the beginning of this Chapter, this Chapter deals with Karmasannyasayoga

2. It is well summed up thus in Sri Yamuna charya's Gitarthasangraha

> कर्मयोगस्य सौकर्यं शैघ्र्यं काश्चन तद्विधाः ।
> ब्रह्मज्ञानप्रकारश्च पञ्चमाध्याय उच्यते ॥

The Lord teaches in this Chapter that wonderfull secret of dispassion and renunciation by which the ultimate bliss of wisdom and God realisation is reached He asks us to give up the foolish notion that the path of selfless work is different from that of self renounced action Both if resolutely pursued lead to the same result But the former is easier than the latter The goal is the bliss of god love and God realisation As the last verse in the Chapter says:

> भोक्तारं यज्ञतपसां सर्वलोकमहेश्वरम् ।
> सुहृदं सर्वभूतानां ज्ञात्वा मां शान्तिमृच्छति ॥

Thus ends the Chapter

KARMA SANNYASA YOGA.

CHAPTER VI.

Atmasamyama Yoga.

PRELIMINARY OBSERVATIONS.

1. This Chapter is called the आत्मसंयमयोगाध्याय. It deals primarily with Rajayoga culminating in Dhyana, Dharana, and Samadhi.

2 The 5th Chapter has shown to us that the path of Karma Yoga is easier than the too-early adopted path of *Vividisha Sannyasa*. This Chapter gives us the luminous means by which the self-realisation towards which we strive by means of the discipline of work (Karma Yoga) can be perfected Without the help of *Yoga*, we cannot attain a realisation of the true being of soul and God Without it we cannot attain the highest bliss of Bhakti or Jnana. Without it the bhakti that we have is but a shadow of the Para bhakti Without it the jnana that we attain is but a shadow of the supreme jnana. The Yoga Chudamanyupanishad says

यत्समाधौ परं ज्योतिरनन्तं विश्वतोमुखम् ।
तस्मिन्दृष्टे क्रियाकर्म यातायातो न विद्यते ॥

3 Sri Sankaracharya points out in his introduction that this chapter is an exposition of the sutra like verse No 27 in Chapter V (स्पर्शान्कृत्वा बहिर्बाह्यान्) and that the Lord teaches us that Karma is the *Bahiranga* (outer instrument) of Dhyana Yoga and finds its fulfilment in Dhyana.

4. Sri Ramanujacharya says, pursuing his own line of thought, that Karma Yoga and Jnana Yoga, perfected by Raja Yoga leads to the realisation of the Atman. Such Atman so freed from Gunasanga (samsaric state) has an inevitable and irresistible and eternal flow of love towards God (Bhakti) which is the means by which there comes an inevitable and irresistible and eternal flow from God of Grace and Bliss which is Moksha.

5 Sri Madhvacharya says that in this chapter we are taught the Samadhi Yoga which is the innermost and most efficient means of Yoga ध्यानान्तरङ्ग समाधियो ।माह्यानेनाभ्यायेत

6 Thus the net result of all these teachings and expositions is that the practice of Raja Yoga with all eight angas is the means by which the seed of Karma Yoga becomes transformed into the celestial blossom of Bhakti Yoga and the ambrosial fruit of paradise of Jnana Yoga.

श्रीभगवानुवाच

अनाश्रितः कर्मफलं कार्यं कर्म करोति यः ।
स संन्यासी च योगी च न निरग्निर्न चाक्रियः ॥

The Lord said

He who performs his bounden duty without desiring the fruit of action he is the true renouncer of action and the true doer of action, not he who has given up the fire (in which Srauta Karma has to be performed) and the rites (which have to be performed according to the Smritis).

NOTES

1 Sri Sankaracharya points out that this stanza really implies that a Karmayogin has to perform Karma Yoga till by purity of mind he attains Dhyana Yoga

2. If a man gives up his Vedic rites, tapas, dana etc , and poses as a jnani, that by itself cannot make him a true sannyasin What is required is renunciation of desire It is not proper that a man should consciously and prematurely renounce action. But when the fulfilled renunciation of desire is complete, renunciation of action will come in the form of Dhyana Yoga and Jnana Yoga. Then freed from Gunasanga (attachment to gunas) the soul rests in its own glory.

وکفنوہ فی ثوبین[1]"، مگر شہیدان حق کے لئے یہ بات ہوئی کہ اُن کی پاکی شرمندۂ آبِ غسل نہیں "لم یصل علیہم ولم یغسلہم[2]" بلکہ اون کے خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کو بھی اُن سے الگ نہ کیجئے "ید فنوا فی ثیابہم و دمائہم[3]" اور اسی لباس گلگوں و خلعت رنگیں میں وہاں لے جائیے جہاں اُن کا انتظار کیا جا رہا ہے، اور جہاں خونِ عشق کے سرخ دھبوں سے بڑھکر شاید اور کوئی نقش و نگارِ عمل مقبول و محبوب نہیں۔ عند ربہم یرزقون۔ فرحین بما آتاہم اللہ[4]!

خون شہیداں را ز آب اولی ترست
این گناہ از صد ثواب اولی ترست!

اللہ اللہ! یہاں طہارتِ جسم و لباس کا کیا سوال ہے؟ امام احمد بن حنبل نے اپنی تمام عمر میں اگر کوئی پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی۔ اُن کی تمام عمر کی وہ نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئی تھیں، اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جس کو راہِ ثباتِ حق میں بہنے والے خون نے مقدس و مطہر کر دیا تھا! سبحان اللہ! جس کے عشق میں بھاری بوجھل بیڑیاں پاؤں میں پہن لی تھیں جس کی خاطر سارا جسم زخموں سے

(۱) پانی اور بیری کی پتی سے اسے نہلاؤ اور دو کپڑوں میں کفناؤ۔

(۲) بخاری و ترمذی میں شہدائے احد کی نسبت حضرت جابر کی روایت ہے۔ یہ اس کے الفاظ ہیں۔ او کما قال۔

(۳) ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے: امر بقتلی احد ان ینزع عنہم الحدید والجلود وان یدفنوا فی ثیابہم و دمائہم (یا قریب قریب اس کے الفاظ ہیں)

(۴) اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں خدا کی دین پر خوش و خرم ہیں۔

أعطوني شيئًا من كتاب الله او سنة رسوله حتى اقول له"[1] عین حالتِ صوم میں کہ صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا' تو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہوگئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہوگیا۔ خود کہتے ہیں جب ہوش آیا تو چند آدمی پانی لائے اور کہا پی لو مگر میں نے انکار کر دیا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔ وہاں سے مجھے اسحاق بن ابراہیم کے مکان میں لے گئے۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا تھا۔ ابن سماعہ نے امامت کی اور میں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ابن سماعہ نے کہا تم نے نماز پڑھی حالانکہ خون تمہارے کپڑوں میں بہ رہا ہے؟ یعنی دم جاری دکثیر کے بعد طہارت کہاں رہی؟ میں نے جواب دیا "قد صلى عمر وجرحه يثعب دمًا" ہاں مگر میں نے وہی کیا جو حضرت عمر نے کیا تھا۔ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔ اور قاتل نے زخمی کیا مگر اسی حالت میں انھوں نے نماز پوری کی!

ابن سماعہ کے جواب میں حضرت امام نے حضرت عمر کی جو نظیر پیش کی تو یہ ان کی تشفی کے لئے بس کرتی تھی، مگر میں کہتا ہوں جو خون اس وقت امام احمد بن حنبل کے زخموں سے بہ رہا تھا، اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہو سکتی تو پھر دنیا میں اور کون سی چیز ایسی ہے جو انسان کو پاک کر سکتی ہے؟ اور کون سا پانی ہے جو طاہر و مطہر ہو سکتا ہے؟ اگر یہ ناپاک ہے تو دنیا کی تمام نیکیاں اس ناپاکی پر قربان، اور دنیا کی ساری طہارتیں اس پر سے نچھاور! یہ کیا بات ہے کہ پاک ... اور مقدس سے مقدس انسان کی میت کے لئے بھی غسل ضروری ٹھہرا کہ "اغسلوني بماء مید

---

[1] ... سنت رسول ... سے کچھ میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں یہ کہہ دوں۔

مرحوم ... عنہم

کے پھول چن سکتے ہیں لیکن وہ پھول چھوڑ کر دہکتے ہوئے انگارے پکڑ لیتے ہیں۔ اور اسی لئے اُن کا اجرو ثواب بھی "مثل اجر خمسین رجلاً یعملون مثل عملکم" کا حکم رکھتا ہے مانا کہ ضعیفوں اور درماندوں کے لئے رخصت و گلو خلاصی کی راہیں بھی باز رکھی گئی ہوں لیکن اصحاب عزائم کا عالم دوسرا ہے اُن کی ہمتِ عالی بھلا میدان عزیمت و اسبقیت بالخیرات چھوڑ کر تنگنائے رخصت و ضعف میں پناہ لینا کب گوارا کر سکتی ہے؟ جوانانِ ہمت اور مردان کارزار یہ ننگ کیوں قبول کرنے لگے کہ کمزوروں اور درماندوں کی لکڑی کا سہارا پکڑیں؟ جن کے لئے سلامتی ہے، ہوا کرے مگر اُن کیلئے تو ایسا کرنا ہمت کی موت ہے، ایمان کی پامالی ہے اور عشق کی جبینِ عزت کے لئے داغ ننگ و عار سے کم نہیں۔ حسنات الابرار سیئات المقربین! رخصت و عزیمت کی تفریق اور اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز اصحاب عمل کے لئے ہے نہ کہ اصحاب عشق کے لئے۔ عشق کی راہ ایک ہی ہے۔ اور اُس میں جو کچھ ہے عزیمت ہی عزیمت ہے۔ ضعف و بیچارگی کا ذکر ہی کیا وہاں رخصت کا نام لینا بھی کم از معصیت نہیں۔ کما قال بعض المحبین العارفین:

ملت عشق از ہمہ دیں ہا جدا است

عاشقاں را مذہب و ملت خدا است!

حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں جب معتصم باللہ نے جلادوں کو ضرب تازیانہ کے لئے حکم دیا تو وہ علماء اہل سنت بھی دربار میں موجود تھے جو شدتِ محن و مصائب کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا "من صنع من اصحابک، فی ھذا الامر ما تصنع" خود تمہارے ساتھیوں میں سے کس نے ایسی ہٹ کی جیسی تم کر رہے ہو؟ امام احمد نے کہا یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی

تو مایوس ہو کر چلے آئے کہ انہیں سمجھانا بیکار ہے۔ یہ جو میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ "عزیمت دعوت" "عزیمت دعوت" تو یہ ہے عزیمت دعوت، اور یہ ہے وراثت و نیابت مقام فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل کی، اور یہ ہے خاصۂ مرتبۂ عظمیٰ "من یجدد لها دینها"[1] کا اور یہ ہے اُن ایام فتن کا صبر اعظم و اکبر جن کی نسبت ترمذی کی روایت میں فرمایا۔ الصبر فیهن کالقبض علی الجمر[2] "تو یہی وہ لوگ ہیں جو اگر چاہیں تو گوشۂ رخصت و بیچارگی میں امن و عافیت

بقیہ صفحہ ۱۴

ذلک عن دینه. والله لیتمن هذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضر موت لا یخاف الا الله ولکنکم تستعجلون" یہ ہجرت سے پیشتر کا واقعہ ہے۔ بعض صحابہ نے عرض کیا۔ اعداء حق کے ظلم و جور کی حد ہو گئی۔ آپ ہمارے لئے دعا نہیں کرتے؟ فرمایا تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں کہ ظالموں نے اُن کو گڑھوں میں کھڑا کر کے آرہ سے چیر دیا، مگر اس پر بھی انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا" اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو ہڈی اور پٹھے سے جدا کر دیتی تھیں لیکن اس پر بھی ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ خدا کی قسم دعوت حق کا جو کام شروع ہوا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت قریب ہے جب یمن سے حضر موت تک ایک سوار چلا جائے گا اور بجز اللہ کے اور کسی کا خوف اس کے دل میں نہ ہوگا۔ (یعنی راہ میں ہر جگہ صرف مسلمان ہی ہونگے۔ کوئی غیر نہ ہوگا جو حملہ کرے یا لوٹے) یہ ہونے والا ہے مگر تم جلد باز ہو" امام بخاری باب علامات النبوت میں ایک دوسری حدیث عدی بن حاتم کی بھی لائے ہیں "لترین الظعینة ترتحل من الحیرة حتی تطوف بالکعبة" و "لیفتحن کنوز کسریٰ" یعنی آپ نے فرمایا اے عدی اگر تم جیتے رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت تن تنہا سفر کر کے آئے گی اور کعبہ کا طواف کرے گی اور اس تمام سفر میں اللہ کے سوا کوئی ڈر اس کے لئے موجب خوف نہ ہوگی اور قریب ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسریٰ کے خزانے کھول دیئے جائیں۔ عدی کہتے ہیں میں زندہ رہا اور دونوں باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ و کنت فی من فتح کنوز کسریٰ!

وہ زمانہ کیا ہوا جب مرے گریہ میں اثر تھا ... یہی چشم خونفشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا!

---

(۱) جو امت کے لئے اس کا دین تازہ کرے گا۔

(۲) ... مٹھی میں ... پکڑ ... انگارہ ...

اُن کی نظروں میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے! اور یہ بالکل حق ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں جلال آلٰہی سمایا ہو، وہ مٹی کی اُن تپلیوں کو جنہوں نے لوہا تیز کر کے کاندھے پر ڈال رکھا ہے یا بہت سا چاندی سونا اپنے جسم پر لپیٹ لیا ہے کیا چیز سمجھتے ہیں؟ اُن کو تو خود اقلیم عشق الٰہی کی سروری و شاہی اور شہرستان صدق و صفا کا تخت و تاج حاصل ہے:

مبیں حقیر گدایانِ عشق را، کیں قوم

شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند!

ابوالعباس الرقی سے حافظ ابن جوزی روایت کرتے ہیں کہ جب رقہ میں امام موصوف قید تھے، تو علماء کی ایک جماعت گئی اور اس قسم کی روایات و نقول سنانے لگی جن سے بخوفِ جان تقیہ کر لینے کی رخصت نکلتی ہے۔ امام موصوف نے سب سن کر جواب دیا۔ کیف تصنعون بحدیث خباب؟ ان من کان قبلکم کان ینشر احدھم بالمنشار ثم لا یصدہ ذلک شیء عن دینہ۔ قالوا فیئسنا منہ۔" یعنی یہ تو سب کچھ ہوا مگر بھلا اس حدیث کی نسبت کیا کہتے ہو کہ جب صحابہ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مظالم و شدائد کی شکایت کی تو فرمایا۔ تم سے پہلے ایسے لوگ گذر چکے ہیں جن کے سروں پر آرہ چلایا جاتا تھا اور جسم لکڑی کی طرح چیر ڈالے جاتے تھے۔ مگر یہ آزمائشیں بھی انہیں حق سے نہیں پھرا سکتی تھیں[1]! ابوالعباس کہتے ہیں جب ہم نے یہ بات سنی

---

(۱) اصل حدیث کے الفاظ صحیح بخاری میں یہ ہیں یا قریب قریب اس کے "شکونا الی رسول اللہ صلعم وھو متوسد بردۃ لہ فی ظل الکعبۃ قلنا الا تدعو اللہ لنا؟ قال کان الرجل فیمن قبلکم یحفر لہ فی الارض فیجعل فیہ فیجاء بالمنشار فیوضع علی راسہ فیشق و ما یصدہ ذلک عن دینہ۔ ویمشط بامشاط الحدید ما دون لحمہ من عظم و عصب و ما یصدہ

(باقی بر صفحہ ۳۸)

چو غلام آفتابم ہمہ زآفتاب گویم

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

اگر اس چراغ تجدید و مصباحِ عزیمت دعوت کی روشنی مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر نہ تھی تو پھر یہ کیا تھا کہ جب معتصم ہر طرح عاجز آ کر قاضی ابن ابی داؤد وغیرہ علمار بدعت و اعتزال سے کہتا "ناظروہ وکلموہ" اور وہ کتاب و سنت کے میدان میں عاجز آ کر اپنے اوہام و ظنون باطلہ کو باسم عقل ورائے پیش کرتے تو وہ اُس کے جواب میں بے ساختہ بول اٹھتے "ما ادری ماھذا" میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے؟ اعطونی شیئا من کتاب اللہ او من سنۃ رسولہ حتی اقول" اس تمام کائنات ہستی میں میرے سر کو جھکانے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ اس کے سوا دین میں نہ میرے لئے کوئی دلیل ہے نہ علم:

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس!

امام موصوف کو جب قید کر کے طرطوس روانہ کیا گیا تو ابو بکر الاحول نے پوچھا "ان عرضت علیک السیف" اگر تلوار کے نیچے کھڑے کر دیئے گئے تو کیا اس وقت مان لوگے؟ کہا نہیں ہیثم بن مصعب کوتوال کہتا ہے میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے زیادہ بے ہیبت نہ پایا ہو "ما نحن فی عینیہ الا کامثال الذباب" ہم عمال حکومت

نبوت کی حامل تھی، لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر
پیچھے ہٹ جاتا اور پھر نیا تازہ دم جلاد اس کی جگہ لیتا۔ یہ بھی خوشی خوشی برداشت کر لیا، مگر اللہ
کے عشق سے منہ نہ موڑا اور راہِ سنت سے منحرف نہ ہوئے۔ تازیانے کی ہر ضرب پر بھی جو صدا
زبان سے نکلتی تھی، وہ نہ تو جزع و فزع کی تھی نہ شور و فغاں کی، بلکہ وہی تھی جس کے لئے یہ سب کچھ
ہو رہا تھا۔ یعنی "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق"(۱) اللہ اللہ! یہ کیسی مقامِ دعوتِ کبریٰ کی خسروی
وسلطانی تھی، اور وراثت و نیابتِ نبوت کی ہیبت و سطوت کہ خود المعتصم باللہ جس کی
ہیبت و رعب سے قیصرِ روم لرزاں و ترساں رہتا تھا، سر پر کھڑا تھا، جلادوں کا مجمع
چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا، وہ بار بار کہہ رہا تھا "یا احمد! و اللہ انی علیک
لشفیق و انی لاشفق علیک کشفقتی علی ھارون ابنی، و اللہ لئن اجبتنی
لاطلقن عنک بیدی۔ ما تقول؟" یعنی واللہ میں تم پر اس سے بھی زیادہ شفقت رکھتا ہوں
جس قدر اپنے بیٹے کے لئے شفیق ہوں۔ اگر تم خلقِ قرآن کا اقرار کر لو تو قسم خدا کی ابھی اپنے
ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں۔ لیکن اُس پیکرِ حق، اُس مجسمہ سنت، اُس مؤید بالروح
القدس، اُس صابر اعظم کما صبر اولو العزم من الرسل کی زبان صدق سے ہر مرتبہ یہی
جواب نکلتا۔ اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ۔ اللہ کی کتاب
میں سے کچھ دکھلا دو یا اُس کے رسول کا کوئی قول پیش کر دو تو میں اقرار کر لوں، اس کے سوا میں
اور کچھ نہیں جانتا!

---

(۱) قرآن کلام الٰہی غیر مخلوق ہے۔

کی نگہبانی کرو، اپنے دل کے علاج میں لگ جاؤ، جو کچھ جانتے ہو اس پر عمل کئے جاؤ، جو برا ہو اسے چھوڑ دو! کوئی کہتا "ھٰذا زمان السکوت و ملازمۃ البیوت" یہ زمانہ خاموشی کا زمانہ ہے اور اپنے اپنے دروازوں کو بند کرکے بیٹھ رہنے کا[1] جبکہ تمام اصحاب کار وطریق کا یہ حال ہو رہا تھا، اور دین الخالص کا بقا، وقیام ایک عظیم الشان قربانی کا طلبگار تھا، تو غور کرو کہ صرف امام موصوف ہی تھے جنکو فاتح وسلطان عہد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے نہ تو دعاتِ فتن وبدعت کے آگے سر جھکایا، نہ روپوشی خاموشی وکنارہ کشی اختیار کی، نہ صرف بند حجروں کے اندر کی دعاؤں اور مناجاتوں پر قناعت کرلی، بلکہ دین خالص کے قیام کی راہ میں اپنے نفس ووجود کو قربان کردینے اور تمام خلفِ امت کے لئے ثبات واستقامت علی السنت کی راہ کھولدینے کیلئے بحکم فاصبر کما صبر اولو العزم من الرسل[2] اٹھ کھڑے ہوئے ان کو قید کیا گیا، قیدخانے میں چلے گئے۔ چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں ڈالی گئیں، پہن لیں۔ اسی عالم میں بغداد کو طرطوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی کی مدد کے خود ہی اونٹ پر سوار ہوں اور خود ہی اونٹ سے اتریں، اسے بھی قبول کرلیا، بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے ہل نہیں سکتے، اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے عین رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر میں جس کی طاعت اللہ کو تمام دنوں کی طاعت سے زیادہ محبوب ہے، بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے، اور آس پاس بیٹھ کر پرتکلف کھانے

---

(۱) یہاں ایک طویل حاشیہ تھا "تذکرہ" میں دیکھو۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصہ میں آیا

اپنے رنگ میں سب صاحبِ مراتب و مقامات تھے۔ مگر اس مرتبہ میں اور کسی کا ساجھا نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قیامِ سنت و دین خالص کا قیامت تک کے لئے فیصلہ ہونے والا تھا، مامون و معتصم کے جبر و قہر اور بشر مریسی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جابرۂ معتزلہ کے تسلط و حکومت نے علماءِ حق کے لئے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے۔ یا اصحابِ بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلۂ خلق قرآن پر ایمان لا کر ہمیشہ کے لئے دین میں نئے نئے اضافات و محدثات کا دروازہ کھول دیں یا پھر قید خانے میں رہنا ہر روز کوڑوں سے پیٹا جانا، اور ایسے تہ خانوں میں بند ہو جانا کہ "لا یرون فیہ الشمس ابدا"[1] قبول کر لیں۔ بہتوں کے قدم تو ابتدا ہی میں لڑکھڑا گئے۔ بعضوں نے ابتدا میں استقامت دکھلائی لیکن پھر ضعف و رخصت کے گوشے میں پناہ گیر ہو گئے۔ عبداللہ بن عمر القواریری اور حسن بن حماد امام موصوف کے ساتھ ہی قید کئے گئے تھے۔ مگر شدائد و محن کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ بعضوں نے روپوشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی کہ کم سے کم اپنا دامن تو بچا لے جائیں۔ کوئی اس وقت کہتا تھا "لیس ھذا زمان حدیث، انما ھذا زمان بکاء و تضرع و دعاء کدعاء الغریق" یعنی یہ زمانہ درس و اشاعت علوم و سنت کا نہیں ہے۔ یہ تو وہ زمانہ ہے کہ بس اللہ کے آگے تضرع و زاری کیجئے اور ایسی دعائیں مانگئے جیسی سمندر میں ڈوبتا مانگے! کوئی کہتا "احفظوا السنتکم و عالجوا قلوبکم و خذوا ما تعرفوا و دعوا ما تنکروا" اپنی زبانوں

---

(۱) اور جس میں کبھی سورج نہیں دیکھتے۔

کیا خوب فرمایا حافظ ابن جوزی نے امام موصوف کے حالات میں کہ "فکانما کانت تلک السیاط حلیا حلی بہ" یعنی انہیں کوڑوں سے پیٹا گیا اور شکیں کی گئیں لیکن ان باتوں سے اُن کی عزت عظمت گھٹنے کی جگہ اور بڑھ گئی گویا یہ ضرب تازیانہ اُن کے جمالِ عظمت و اجلال کا زیور تھا کہ جب پہنا دیا گیا تو رعنائی و خوبروئی دوچند ہو گئی!

نالہ از مہربانی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود!

فصل

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال و تعمق فی الدین نے سر اٹھایا اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگا تار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیر استبداد نے اِس فتنہ کا ساتھ دیا، حتی کہ بقول علی بن المدینی فتنۂ ارتداد و منع زکوٰۃ کے بعد یہ دوسرا فتنۂ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا، تو کیا اس وقت علماء امت اور ائمہ شریعت سے عالم اسلامی خالی ہو گیا تھا؟ غور تو کرو کیسے کیسے اساطین علم و فن اور اکابر فضل و کمال موجود تھے؟ خود بغداد علماء اہل سنت و حدیث کا مرکز تھا مگر سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے اور عزیمت دعوت، و کمال مرتبۂ وراثت نبوت، و قیام حق و ہدایت فی الارض والامت کا وہ جو ایک خاص مقام تھا، وہ صرف ایک ہی قائم للہ اللہ کے حصہ میں آیا یعنی سید المجددین و امام المصلحین حضرت امام احمد بن حنبل

ضرب مردانہ وار برداشت کر لینے اور مبغوض بتدعین آل مروان اور محبوب قلوب مومنین ہونے کا جو شرف سید التابعین حضرت سعید بن المسیب کے حصہ میں آیا، اس میں تو اُن کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا؟ منصور عباسی کے زمانے میں کون کہہ سکتا ہے کہ اصحاب علم و عمل کا کال تھا؟ لیکن معلوم ہے کہ شاہان جور کے مقابلے میں ثباتِ حق و اعتقاد کا جو مقام عزیمت امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما کو بہ ضمن مسئلۂ یمین و طلاق مکرہ ملا، وہ تو صرف انہی کے لئے تھا؟ یہ کیا چیز تھی کہ عین اُس وقت جبکہ مشکیں اس زور سے کس دی گئی تھیں کہ ہاتھ بازو سے اُکھڑ گیا تھا اور ستر کوڑوں کی ضربیں اُن کے جسم اقدس پر پڑ رہی تھیں، تو اسی اونٹ کی پیٹھ پر کھڑے ہو گئے جس پر تذلیل و تشہیر کے لئے سوار کرایا گیا تھا، اور پکار کر کہا "من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا مالک بن انس اقول ان الطلاق المکرہ لیس بشیء" یعنی جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا تو جان لے کہ میں ہوں مالک انس کا بیٹا، اور اسی مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں جس کے اعلان سے روکا جا رہا ہے کہ طلاق مکرہ کوئی چیز نہیں! سبحان اللہ! یہ وہی مقام عزیمت کبریٰ کی شوکت و فرمانروائی تھی جس کے آگے دنیا کی بادشاہتیں بالِ مگس کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں، اور یہی وہ ہیبتِ ربانی اور جلالت روحانی تھی جسے دیکھ کر حضرت سفیان ثوری بے اختیار پکار اُٹھے تھے

فهو المهاب وليس ذا سلطان[1]

---

(۱) وہ بارعب ہے حالانکہ بادشاہ نہیں۔

فصل

اگر تاریخ اسلام کے مختلف دوروں اور سلسلۂ دعوت و تجدید امت مرحومہ کی پچھلی کڑیوں پر نظر ڈالو تو یہ جو کچھ کہا گیا اس کی تصدیق ہر دور کے واقعات پیش کریں گے افسوس کہ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔ ہر دور میں تم پاؤ گے کہ اگرچہ عامۂ علماء و صلحاء امت کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی اور اُن کا فضل و کمال اور ورع و تقویٰ بھی ہر طرح مسلم و ثابت ہے، بلکہ بعض اُن میں ایسے تھے کہ علم و عمل کی متعدد شاخوں میں اپنا عدیل و نظیر نہیں رکھتے تھے، با ایں ہمہ اُس عہد کی عزیمتِ دعوت اور تجدید ملت کے مرتبۂ خاصہ میں اُنکا کوئی حصہ نہ ہوا اور صرف چند افرادِ عزائم ہی کی قسمت میں آیا۔ یا تو اُن کے قدمِ ہمت نے علم و عمل کی دوسری شاخوں پر قناعت کرلی، یا اس راہ میں قدم بڑھانے کی جرأت ہی نہ کرسکے عہدِ اوائل بنوامیہ میں کہ ابھی ہجرت کی پہلی صدی بھی ختم نہیں ہوئی تھی کتنی بڑی جماعت اجلۂ صحابۂ کرام اور ارکان بیت نبوت و بقیۂ صالحۂ خیر القرون کی موجود تھی؟ اور کون ہے جو اُن کی عظمت و شرف میں ایک لمحہ کے لئے بھی شک کرسکے؟ لیکن بدع و محدثات بنوامیہ کے مقابلے میں سرفروشانہ اقدامِ عظیمت و فتحِ بابِ مقاومت و ثبات فی الحق والعدل کا جو ایک مخصوص مقام تھا، وہ تو بجز حضرت امام حسین (علیہ و علی آبائہ و اجدادہ الصلوٰۃ والسلام) کے اور کسی کے حصے میں نہ آیا؟ عبدالملک بن مروان کا زمانہ اجلۂ تابعین و [illegible] ... اتباع سنت و قیام حق کی راہ میں [illegible]

پہلی برکت اصحاب عزائم اور نفوس ذکیۂ امت کے ریاحین قلوب و بساتین ارواح ہی سے بروز ظہور کرتی ہے، اور اگرچہ آفتاب فیضان الٰہی کی تجلی تمام بحر و بر کو ظلمت غفلت و بطالت سے نجات دلانا چاہتی ہے مگر اُس کی سب سے پہلی کرنوں سے درخشندہ و جہانتاب ہونے کا حق صرف اُنہی طبائع مستعدہ و قلوب صافیہ کو حاصل ہوتا ہے جنہوں نے اپنی استعدادِ سربلندی و رفعت سے اکتسابِ اسفارِ ہدایت کیلئے اسبقیت و اولیت کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ موسم بہار ہر پھول کو لالی اور ہر پتے کو سبزی بخشے گا، اور صبح کی تجلی ہر ذرہ کو چمکیلا، اور ہر آنکھ کو بینا بنا دے گی، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ جس وقت باغ و چمن میں پھول کھلکھلا رہے تھے اور شاخیں ہنس ہنس کر جھوم رہی تھیں تو اُس وقت اموات صحرا و گلخن کا کیا حال تھا؟ اور جس وقت دیواروں کی اونچی منڈیروں اور مناروں کی چوٹیوں کو صبح تجلی زیور طلائی پہنا رہی تھی تو اُس وقت صحنِ مکان کے گوشوں اور ابواب و محاریب کے نیچے سونے والوں کا بھی اس فیضانِ اول میں حصہ تھا یا نہیں؟ تہ خانوں اور سردابوں کے بسنے والوں کا یہاں ذکر ہی نہیں کرنا چاہئے۔ اُن کے لئے تو شاید والنہار اذا تجلّٰی[1] کا وقت ہی روشنی کی پہلی کرن بہم پہنچائے، ورنہ والفجر اور والضحیٰ کے مراتب اولیۂ تنویر تو اُن کے لئے واللیل اذا یغشیٰ[2] کے حکم میں داخل ہیں!

---

(۱) قسم دن کی جب روشن ہو جائے۔

(۲) قسم رات کی جب گھر جائے۔

وہ بھی بالواسطہ اسی کے فیضان بخشش میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ وقد احسن من قال۔

گر گفتۂ ز عشق گہے حرف آشنا

آنہم حکایتیست کہ از من شنیدۂ

قرآن حکیم نے ہدایت کو حیاتِ ارض سے تعبیر کیا ہے اور ضلالت کو زمین کی موت سے اور
ہدایت خود زندگی ہے۔ استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم[1] اور ضلالت موت
ہے۔ وما انت بمسمع من فی القبور[2] اور اموات غیر احیاء[3] بہار کا جب موسم آتا ہے تو
کو زمین کے ہر گوشہ کو روئیدگی و سرسبزی سے مالا مال کر دینا چاہتا ہے مگر سب سے پہلے اسکی
آمد کی برکتیں باغ و چمن ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور صبح کا طلوع اگرچہ دنیا کے گوشے گوشے
کے لئے پیام نور ہوتا ہے مگر سورج کی پہلی کرنیں اونچی دیواروں اور بلند میناروں ہی پر چمکتی
ہیں گو بعد کو نچلے سے نچلے تہ خانے بھی روشن ہو جائیں گے یہی حال عہد ہدایت اور دور
فیوض و برکاتِ سماویہ کا بھی ہے اس عالم میں بھی بے خزاں و بہار کے موسم آتے ہیں
بہر حال بہار کا اختلاف موجود ہے۔ وما یعقلہا الا العالمون[4] ۔ واگرچہ بہار سعادت کا
یہ موسم سارے جہان اور ساری زمین کے لئے پیام حیات و کامرانی ہے لیکن اس کی سب سے

[illegible]

[illegible]

یہی وجہ ہے کہ جا بجا "عزیمت دعوت" کا لفظ بولا گیا نہ کہ مجرد دعوت کا۔ دونوں میں فرق و امتیاز ملحوظ خاطر رہے پس اپنے عہد کا مجدد، وہی وہ شخص یا وہ چند نفوس خاصہ ہوتے ہیں جو مجرد دعوت نہیں بلکہ عزائم امور دعوت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور قیام حق کا صور اس زور سے پھونکتے ہیں کہ یکایک تمام ملت جنبش میں آجاتی ہے، اور تمام اموات غفلت اپنی اپنی قبروں کے اندر چونک اٹھتے اور اٹھکر دوڑنے لگتے ہیں، گویا یخرجون من الاجداث کانھم جراد منتشر مھطعین الی الداع[1] اور ذلک یوم الخروج کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔ یہی وہ مقام خاص ہے جو ہر عہد میں صرف ایک یا چند افراد عالیہ ہی کے حصے میں آتا ہے اور گو کاروبار دعوت سے معاملات رکھنے والے بہت سے موجود ہوں مگر اس عہد کے فتح باب اور سلطان و امر دعوت کی فضیلت ان کو نصیب نہیں ہوتی۔ سب ناچار ہوتے ہیں کہ اس فاتح عہد اور عازم وقت ہی کے حلقۂ اتباع و ذریات میں داخل ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں بعض افراد کسی خاص شاخ علم و عمل میں درجۂ بلند رکھتے ہوں، مگر اس معاملہ کیلئے وہ کچھ سود مند نہیں ہوتا اور فاتح دور کے آگے ان کو اطفال مکاتب کی طرح زانوئے ادب و استفادہ تہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس عہد کے خزائن فیضان و برکات کی کنجی اسی کے قبضہ میں دیدی جاتی ہے۔ پس طالبین فیضان اس کے حلقۂ ارادت سے الگ رہکر کچھ نہیں پا سکتے اگر کسی نے بطریق استراق سمع کوئی کلمۂ حقیقت حاصل بھی کرلیا تو اول تو وہ مثمر برکات نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چونکہ عہد کی سلطانی فاتح و عازم دعوت ہی کو پہونچتی ہے، اس لئے

---

(۱) منتشر ٹڈی دل کی طرح قبروں سے نکلیں گے گردنیں سیدھی کئے پکارنے والے کی طرف۔

تمام کلام میں سے یہی ایک شعر منتخب کیا اور سبحان اللہ کہ اپنے حسن انتخاب اور ذوق سلیم کا کیسا مرقص ثبوت دے گیا!

زفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد!

واذا الہامات شعریۂ عرفی چہ ملیح سبت ایں فرد دریں مقا

ہاں رہ عشق ست کہ کشتن ندارد بازگشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!

غرضکہ ایک چیز دعوت ہے ایک عزیمت دعوت اور ایک عزیمت دعوت کا درجۂ تجدید و مقام قیام دعوت عامہ۔ اور ایک مقام اصلاح افراد کا ہے ایک عائلہ و جماعت کا اور ایک امت و نوع کا، سو اگرچہ دعوت موجود ہوتی ہے، مگر عزیمت دعوت مفقود ہو جاتی ہے اور اگرچہ اصلاح افراد کا سامان ہوتا ہے مگر اصلاح امت کا کوئی سامان نہیں ہوتا اگرچہ اصحاب عزائم ہوتے بھی ہیں تو اسباب و موانع مذکورہ سے درجۂ تجدید و کمال عزیمت دعوت تک اُن کی رسائی نہیں ہوتی۔ کالبد دعوت کے کالبد و اشکال تو موجود ہوتے ہیں مگر روح فتح و نصرت مفقود ہو جاتی ہے۔ اسی لئے معاملہ تجدید و احیاء امت اپنے کشورکار کے لئے کسی مرد غیب کا منتظر ہوتا ہے:

عشق گر مرد ست مردے تا بہ پیدا آورد
ورنہ تا [illegible] دو پیدا آورد

مثلاً جس منزل سے سفر کا آغاز ہونا چاہئے، اوس کو درمیانی سمجھ لیا، کہ ان حقائق کار کا علم بلا مقام تشبہ بالانبیاء و تخلق باخلاق الاصفیاء کے حاصل نہیں ہو سکتا، اور یہی وہ غوامض اعمال نبوت ہیں جن کی طرف بعض صحابہ و تابعین اشارہ کر کے کہدیا کرتے تھے کہ "فانذلک من عمل نبوۃ" یا اس سے بھی بڑھکر مصیبت یہ کہ گو دعوت الی الحق کے لئے قدم اٹھا مگر سنت کی روشنی کی جگہ بدعت کی اندھیاری چھاگئی، یا قلاً طریق کار بدعت کی آمیزش سے محفوظ نہ رہا، اور اگر اللہ تعالیٰ نے فہم واسع و سلیم عطا فرمایا ہے تو سمجھ لوگے کہ یہ آخری سبب بڑوں بڑوں کے لئے مزلت اقدام ہوتا آیا ہے اور ایک علت قویہ ضیاع قوائے عمل و کاروبار دعوت و تبلیغ کی صدیوں سے یہی ہوتی آئی ہے۔ یا دعوت و تبلیغ کے بلند مقامات کی طرف ایسے نوآموزان راہ اور خام مغزان کار نے قدم اُٹھایا جو گو اپنے ولولوں اور نیتوں کے لحاظ سے مستحق تحسین ہیں لیکن اس مقام کے لئے جس قوت علمی و عملی کی ضرورت ہے اور جس ثبات قلب و رسوخ عزم کی، وہ ابھی اُن سے منزلوں دور ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو اول قدم ہی میں ٹھوکر لگتی ہے، یا پہلے تیر ہی پر میدان کارزار کو پیٹھ دکھلا دیتے ہیں، حالانکہ یہ وہ راہ ہے کہ یہاں کی ایک ادنی لغزش بسا اوقات ہزاروں انسانوں کی مجموعی معصیت و ذنوب سے بھی بڑھکر مضرت رکھتی ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسافر کو تلووں سے کانٹا نکالنے کی بھی مہلت نہیں دی جاتی، کیونکہ ممکن ہے اتنی ہی دیر میں قافلۂ امید قرنوں بلکہ صدیوں کی مسافت آگے نکل جائے اور ایک لمحہ کی غفلت برسوں کے لئے یاس و ماتم کا سامان کر دے۔ طالب آملی اسی حقیقت کو شاید نادانستہ کہہ گیا ہے، فیضی نے اُس کے

کو چونکا دینے کا شرف حاصل نہیں کر سکتیں۔ یا ایسا ہوتا ہے کہ نفوذ دعوت و سریان امر کے لئے ضروری ہے کہ دعوتِ حق میں ایک ایسی ہمہ گیر جاذبیت و جالبیت ہو جو ایک عالم کے دل لبھائے اور ایک دنیا کو اپنا فریفتہ و دلدادہ بنائے حتیٰ کہ سامع و مشاہد کی طاقت سے باہر ہو کہ اُس کی کشش سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ بغیر اس خاصہ کے دعوت کبریٰ قائم و نافذ نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ دعوتِ حق کی صدائیں تو اٹھتی ہیں۔ مگر اس جاذبیت معنویہ سے محروم ہوتی ہیں اور اس لئے محبوب القلوب عالم نہیں ہو سکتیں۔ یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ بمصداق خلطوا عملاً صالحاً و اخر سیئاً [1] داعیان حق کا جو گروہ موجود ہوتا ہے اُن کی دعوت ٹھیک ٹھیک نہج قویم و مستقیم پر نہیں ہوتی یعنی منہاج نبوت کے علوم و اعمال کو اُن میں غلبہ و احاطہ حاصل نہیں ہوتا۔ یا کتاب و سنت کی دعوت خالص و بے آمیزش کی حقیقت سے خالی ہوتی ہیں پس اگرچہ اس لحاظ سے کہ اصلاً طلب حسنات و اصلاح اور قیام شریعت پر مبنی ہیں، وہ دعوت الی الحق و امر بالمعروف کے حکم میں داخل ہو جاتی ہیں، مگر ساتھ ہی اس اعتبار سے کہ طرح طرح کی غلطیوں اور لغزشوں یا آمیزش ظلمت رائے و قیاس غیر صالح یا کوری بدعات و محدثات سے پاک و صاف نہیں ہیں، اپنا حکم و اثر کھو دیتی ہیں اور برکات نصرت و فوز حاصل نہیں کر سکتیں۔ مثلاً اصل کی جگہ کسی ایک ایسی فرع کی حفاظت کو عزیمت دعوت سمجھ لیا جو بوجہ فقدان و ضیاع اصل بالفعل ناقابل اعتنا تھی، یا سلسلۂ سفر صحت تعین منازل و تقریر بدایت و نہایت کے ساتھ شروع نہیں کیا۔

(۱)

شریک نہ ہو۔ ہوتے ہیں، لیکن یا توان کی جماعت بہت ہی قلیل و درماندہ اور بحال تو دہتلاؤ
گم ہوتی ہے، یا دعوتِ حق کے اعمال بغایت محدود و محصور ہوئے جاتے ہیں یعنی ارباب دعوت
کی پستی ہمت، بلندی و وسعتِ میدانِ عمل سے گھبراتی اور اس کے لئے اپنے کو درماندہ پاتی ہے
اور محض ایک محدود دائرۂ دعوت پر قناعت کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہر چیز کی طرح اس کے بھی
مراتب و مدارج، اور گو ہر مرتبہ اس میں داخل لیکن ہر مرتبہ کا حکم دوسرے سے مختلف۔ اپنے
پڑوسی کو برائی کرتے دیکھکر ٹوک دینا بھی نہی عن المنکر ہے، تمام شہر کو برائی سے باز رکھنے کے لئے
کھڑے ہو جانا بھی نہی عن المنکر ہے، اور پھر عالم تقیید و تحدید سے آزاد ہو کر اپنے تمام عہد
دور کے شر و فساد کو دور کرنے کے لئے بلا امتیاز قرب و بعد و یمین و یسار غلغلۂ عمل بلند کرنا بھی
نہی عن المنکر ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے راستہ سے پتھر ہٹا دینا بھی ایمان کی شاخ اور عمل
ہے، مگر تمام امت کی راہ سے سنگ بطلان و فساد دور کر دینا بھی عمل ایمان و اقدام حق ہے
پھر کیا ان تمام مراتب کا ایک ہی حکم ہو سکتا ہے؟ کجا وہ مقام ارفع و اعلیٰ جہاں ایک عالم
و امت کی اصلاح کے لئے قدم اٹھائے جائیں؟ اور کجا وہ تنگنائے ضعف جہاں صرف
اپنے پڑوسی کی اصلاح ہی پر قناعت کر لی جائے؟ اور اگرچہ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ اصلاح
دونوں ہیں، اور دونوں کے لئے اجر، لیکن پہلا منصب نبوت کی شاخ، اور دوسرا افراد
امت میں سے ایک فردِ مومنِ صالح کا مرتبہ اور بس۔ یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ دعوت کی
صدائیں بڑی ہی دھیمی اور پست ہوتی ہیں۔ ان میں نہ گرج اور کڑک نہیں پائی جاتی
جس کے بغیر نہر شارانِ غفلت چونک نہیں سکتے، اس لئے گو اٹھتی رہتی ہیں لیکن اپنے عہد

جزئیات و فرعیات تک ٹھیک اُسی مقام کے حالات و منازل سے متشبہ و متخلق بل کالظل و العکس ظہور میں آئیں۔ اور منجملہ سنن و نوامیس انبعاث نبوت کے یہ ہے کہ دعوتِ انبیاء کے ظہور کے لئے حق و ذکر حق کا بالکل مفقود و معدوم ہو جانا ضروری نہیں، بلکہ اس قدر بس کرتا ہے کہ سخت درجہ انحلال اور پژمردگی اُس پر طاری ہو جائے، اور داعیانِ حق کی جماعت قلیل و مغلوب ہو۔ بجز یکہ چند منتشر و نادر افراد کے سوا اُن کی کوئی ہستی اور جماعت باقی نہ رہے، برخلاف اِس کے داعیانِ فساد و ضلالت کا ہر طرف دور دورہ ہو، اور وہ جو ایک چیز ہے، یعنی صرف حق کا وجود ہی نہیں بلکہ حق کا قیام و ظہور و نفوذ اور مجرد امر و دعوت ہی نہیں بلکہ دعوت کا نظام و قوام اور محض دعوتِ افراد و جماعات ہی نہیں بلکہ دعوتِ دولت و ملت، تو اُس کا کارخانہ بالکل درہم برہم ہو جائے۔ یہی غربت و اقلیتِ حق ہے جو بسبب کمال ضعف و بیچارگی و عدم حصول نتائج مطلوبہ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے، اور جب غایت درجہ تک پہونچ جاتی ہے تو ظہر الفساد فی البر والبحر سے تعبیر کی جاتی ہے۔

پس جب انبیاء کرام علیہم السّلام کی دعوتِ اصلیہ و اساسیہ کا یہ حال ہوا، اور ہنگامِ ظہور ایک جماعت قلیلہ داعیاتِ حق کی موجودگی اُن کے مقام دعوت و تبلیغ کی اسبقیت و اولیت کے منافی نہ ہوئی، تو ظاہر ہے کہ مجددین امت و نقباء و ورثاء نبوت کے مرتبہ تجدید کے لئے یہ امر کیوں منافی ہو؟

اس عالم کے معاملات بھی تبعاً و فرعاً ویسے ہی واقع ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس عہد ... نہ ہوں، یا نفس دعوت میں اُن کا اور کوئی سہیم و

شریک نہ ہو۔ ہوتے ہیں، لیکن یا تو ان کی جماعت بہت ہی قلیل و درماندہ اور بحال خود مبتلا و گم ہوتی ہے، یا دعوتِ حق کے اعمال بغایت محدود و محصور ہو جاتے ہیں، یعنی ارباب دعوت کی پستی ہمت، بلندی و وسعتِ میدانِ عمل سے گھبراتی اور اس کے لئے اپنے کو درماندہ پاتی ہے اور محض ایک محدود دائرۂ دعوت پر قناعت کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہر چیز کی طرح اس کے بھی مراتب و مدارج، اور گو ہر مرتبہ اس میں داخل لیکن ہر مرتبہ کا حکم دوسرے سے مختلف۔ اپنے پڑوسی کو برائی کرتے دیکھکر ٹوک دینا بھی نہی عن المنکر ہے، تمام شہر کو برائی سے باز رکھنے کے لئے کھڑے ہو جانا بھی نہی عن المنکر ہے، اور پھر عالم تقیید و تحدید سے آزاد ہو کر اپنے تمام عہد و دور کے شر و فساد کو دور کرنے کے لئے بلا امتیاز قرب و بعد و یمین و یسار غلغلۂ عمل بلند کرنا بھی نہی عن المنکر ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے راستہ سے پتھر ہٹا دینا بھی ایمان کی شاخ اور عمل حق، مگر تمام امت کی راہ سے سنگ بطلان و فساد دور کر دینا بھی عمل ایمان و اقدام حق ہے، پھر کیا ان تمام مراتب کا ایک ہی حکم ہو سکتا ہے؟ کجا وہ مقام ارفع و اعلیٰ جہاں ایک عالم و امت کی اصلاح کے لئے قدم اٹھائے جائیں؟ اور کجا وہ تنگنائے ضعف جہاں صرف اپنے پڑوسی کی اصلاح ہی پر قناعت کر لی جائے؟ اور اگرچہ وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى صلاح دونوں ہیں، اور دونوں کے لئے اجر، لیکن پہلا منصب نبوت کی شاخ، اور دوسرا افراد امت میں سے ایک فردِ مومنِ صالح کا مرتبہ اور بس۔ یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ دعوت کی صدائیں بڑی ہی دھیمی اور پست ہوتی ہیں۔ ان میں وہ گرج اور کڑک نہیں پائی جاتی جس کے بغیر ہوشارانِ غفلت چونک نہیں سکتے، اس لئے گو اٹھتی رہتی ہیں لیکن اپنے عہد

...ی کی منہاج پر واقع ہوتا ہے اور کسی کا کسی دوسرے نبی کی منہاج پر، اور اس کو بوجہ غلبہ
مابہ الاختصاص اس نبی سے ایک خاص طرح کی نسبت حاصل ہوجاتی ہے۔

والناس فی ما یعشقون مذاہب! (۱)

اور پھر یہ بھی ہے کہ کسی کا قدم جامعیت فص محمدی کا تعاقب کرتا اور مقام جامعیت کبری اور
...سے اکتساب فیضان سے ایک کیفیت بوقلمون اور جلوۂ حسن صد رنگ گوناگوں پر

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کرتا ہے۔ ساری نزاع بمصطلحات والفاظ کی ہے حقیقت بحکم:

عبارا تنا شتی و حسنک واحد! (۲)

ایک ہے اور کوئی نہیں کہ پردہ بر انداز ظواہر والفاظ و رسوم ہو اور نزاع صورت پرستاران
معنیٰ ناآشنا ختم کردے۔

برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے را می پرستند!

...ب دعوت واصلاح امت کا سرچشمہ واصل مقام نبوت ٹھیرا، اور تمام عوازم امور دعوت
...سے ماخوذ اور اسی کے اسوہ سے متأسی، تو ضرور ہے کہ عالم تجدید واحیاء شریعت کے بھی
...ر دوبار اسی اسلوب و نہج پر واقع ہوں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصول واساسات سے لیکر

...میں لوگوں کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔
...بولیاں مختلف ہیں، مگر تیرا حسن ایک ہی ہے۔

وفساد میں بھی ایک جماعت داعیان حق کی ضرور باقی رہتی ہے۔ اور گو علماء اہل کتاب کی گمراہی کمال مرتبہ بغی وعدوان تک پہونچ چکی تھی، تاہم ان میں بھی ایک جماعتِ قلیلہ ایسی موجود تھی جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں کوشاں، تلاوت کتاب اللہ میں سرگرم اور خیرات وطاعات میں تیز گام تھی اور قرآن حکیم ان کو صالحین میں سے شمار کرتا ہے اور اسی طرح بخاری کی روایت میں ہے "فمقتهم عربهم وعجمهم الا بقايا من اہل الکتاب"(۱) یعنی اسلام کے ظہور کے وقت تمام عرب وعجم اپنے کفر وضلالت کی وجہ سے مستحق غضب وعقوبت الٰہی ہو رہا تھا مگر ایک چھوٹی سی جماعت جو اہل کتاب کے اہل حق کا بقایا تھی اور مختلف گوشوں میں مٹی مٹائی اور بچی بچائی باقی رہ گئی تھی(۲) اس سے واضح ہوا کہ خاتم الادیان کے ظہور کے وقت بھی کہ کرۂ ارضی کی ضلالت عامہ کا سب سے بڑا تاریک عہد تھا، یہ بات نہ تھی کہ داعیانِ حق بکلی معدوم ہو گئے ہوں۔ ایسا ہونا سنتِ الٰہی کے خلاف ہے اور اس کی مزید تشریح کا یہ موقع نہیں۔

پس جب انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کے ظہور کے زمانوں میں بھی داعیانِ حق وآمرین بالمعروف وسارعون فی الخیرات سے قوم وملک بالکل خالی نہیں ہو جاتا، اور کچھ بقایا ارباب حق کا موجود رہتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے اتباع وذریات اور ورثاء وبقایا کے لئے، کہ اصحاب عزیمت دعوت ومجددین امت انہی سے عبارت ہیں، ایسا ہونا

---

(۱) تمام عرب عجم سے نفرت کی، الا اہل کتاب کے کچھ بچے کچھے لوگوں کے۔

(۲) یہاں ایک طویل حاشیہ تھا، "تذکرہ" میں دیکھو۔

کہ ایک جماعت اہل حق کی ضرور باقی رہتی تھی اگرچہ ان کا ظہور کرۂ ارضی کے کمال بغی و فساد و منتہیٰ مرتبۂ یاس و قنوط کی حالت میں ہوا کرتا تھا؟ خود قرآن حکیم نے جابجا اس کا اعتراف کیا ہے۔ فلولا من القرون من قبلکم اولو بقیۃ ینہون عن الفساد فی الارض الا قلیلاً ممن انجینا منہم اور سورۂ مائدہ میں ہے کہ باوجود علماء یہود کی سخت و ہمہ گیر ضلالت و مغضوبیت کے ایک قلیل جماعت ان میں بھی داعیان حق و آمرین بالمعروف کی برابر موجود رہی۔ لولا ینہاھم الربانیون والاحبار عن قولہم الاثم و اکلہم السحت[1] اور آل عمران میں ہے۔ لیسوا سواء من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ آناء اللیل و ھم یسجدون۔ یومنون باللہ والیوم الاخر و یامرون بالمعروف و ینہون عن المنکر و یسارعون فی الخیرات و اولئک من الصالحین[2] اور اسی طرح غالباً سورۂ مائدہ میں ایک جگہ خاص طور پر علماء یہود کے شر و فساد کا ذکر کر کے فرمایا۔ منہم امۃ مقتصدۃ و کثیر منہم ساء ما یعملون[3]۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ اقوام و ملل کے سخت سے سخت دورِ ظلمت

---

(۱) اگر انہیں ربانی اور احبار بری بات کہنے اور حرام کھانے سے نہ روکتے۔

(۲) برابر نہیں اہل کتاب میں وہ جماعت جو راتوں کو آیات الٰہی تلاوت کرتی اور سربسجود رہتی ہے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتی ہے، نیکیوں میں پیش قدمی کرتی ہے، یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔

(۳) [illegible] میں ایسے بھی جن کے عمل نہایت برے ہیں۔

من لم یکن للوصال اھلا

فکل طاعاتہ ذنوب! (۱)

غرضکہ اگرچہ دنیا بظاہر علم و فضیلت سے لبریز ہوتی ہے اور بڑے بڑے اصحاب طنطنۂ شہرت و ارباب فخفخۂ عظمت موجود ہوتے ہیں مگر کسی کو اس کی توفیق نہیں ملتی کہ اپنے عہد و دور کی طلبِ دعوت اور سوالِ قیامِ ہدایت پر مردانہ وار لبیک کہے، اور ظلمت کدۂ ضعف و واماندگی سے نکلکر راہِ عزیمتِ دعوت میں قدم رکھے، اور اگرچہ دروازۂ سعادتِ الٰہی باز، اور خزائنِ رحمت و نصرتِ ربانی ہمہ وارہ در صدد بخشش و یغما ہوتے ہیں مگر سینکڑوں ہزاروں علماء عہد اور اصحاب خوانق و صوامع میں سے کسی کو بھی اوس عہد کے احیاء و تجدید اور طائفۂ منصورہ "من یجدد لھا دینھا" میں داخل ہونے اور جماعت علیہ یحبھم و یحبونہ (۲) میں معدود و محشور ہونے کی توفیق نہیں ملتی تاآنکہ پردۂ ظلمت چاک ہوتا اور یکایک صبح ہدایت و سعادت مشرقِ تجدید و انبعاث سے عالم افروز و جہانتاب ہوتی ہے۔ تو اس وقت تم دیکھتے ہو کہ جس راہ میں قدم رکھنے سے ایک عالم درماندہ و ناچار تھا، اچانک ایک مردِ ہمت اٹھتا ہے اور نہ صرف قدم رکھتا ہے بلکہ دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ راہ کی وہ مشکلیں اور صعوبتیں جو ضعفاء عہد کے لئے مصیبتوں کا پہاڑ اور ہیبتوں اور دہشتوں کی گھاٹیاں تھیں، اور جن کے وہم و تصور

---

(۱) جو وصل کا اہل نہیں، اُس کی تمام اطاعتیں گناہ ہیں۔

(۲) وہ اُن سے محبت کرتا ہے اور وہ اُس سے محبت کرتے ہیں۔

ظلم و طغیان کے غلبہ و قہر سے ارض الٰہی کا ایک ایک کونا چیختا اور چلاتا ہے، پرستاران حق کی غربت ہر طرف سر پٹختی، اور ماتم کرتی ہے، خدا کی زمین کے گوشے گوشے سے "وا شریعتا! وا دیناہ! وا مصیبتا! وا ویلاہ!" کی فریادیں اٹھ اٹھ کر آسمان تک جاتی ہیں اور فضاء کائنات کا ایک ایک ذرہ داعی حق کے لئے روتا اور قائم ہدایت کو کھوجتا۔ اور پکارتا ہے:

یا ناعی الاسلام قم وانعہ

قد زال عرف بدا منکر![2]

لیکن نہ تو عباد و زہاد وقت تو تسبیح ہزار دانہ کی گردش مہلت سماعت دیتی ہے اور نہ ہنگامہ سازان مدارس و مجامع کو اساطیر جدل و خلاف و دساتیر قیل و قال کا شور و غوغا فرصت بصائر اصل حقیقت سے اس درجہ بعد و ہجر طاری ہو جاتا ہے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی احیائے شریعت و تجدید ملت کا خطرہ نہیں گذرتا اور کوئی نہیں سوچتا کہ یہ سارے کارخانے اور ہنگامے تو اس لئے تھے کہ لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا[3] سو جب وہی سرنگوں ہو گیا تو پھر ان اجساد بے روح و قشور بے مغز کی پرستش کیا سود مند علم و عمل ہو سکتی ہے؟ اور جب روح امت مضمحل ہو گئی اور حق کی جگہ باطل کی اور سنت کی جگہ بدعت کی حکومت چھا گئی تو پھر یہ تمام باتیں کب مثمر و منتج ہو سکتی ہیں؟ بلکہ ان کا شمار تو اب موانع و مہالک راہ میں ہو گیا

---

(۱) آہ شریعت! آہ دین! آہ مصیبت! آہ ہلاکت!

(۲) اے اسلام پر ماتم کرنے والے اٹھ اور اس پر ماتم کر نیکی چلی گئی اور برائی شروع ہوئی۔

(۳)

ہیں مگر اُن کے لئے دیکھا ہوا آن دیکھا اور سنا ہوا آن سنا ہو جاتا ہے۔ نفس کا عشق اور زخارف تمتعات دنیوی کی شیفتگی اس طرح اُن کے جسموں میں حلول کر جاتی ہے کہ ہمت کی روح اور عزم کی قوت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ راہِ عمل کا ہر تنکا اُن کے لئے پہاڑ ہو جاتا اور جادۂ ابتلاء کا ہر کانٹا تیر و خنجر بنکر اُن کو ڈراتا اور سہماتا ہے۔ وہ آنکھیں جن میں غمِ نفس اور ماتم دنیا کے لئے آنسوؤں کے دریا بند ہوتے ہیں، حق کی غمگینی اور امت کے ماتم کے لئے ایک قطرۂ اشک بھی نہیں رکھتیں، اور جن دلوں میں عشقِ ذات اور محبتِ اہل و عیال کے لئے ایک عالم شورش اور طوفانِ اضطراب مخفی ہوتا ہے، اُس میں اللہ اور اوس کے کلمۂ حق کے عشق کے لئے درد کی ایک ٹیس اور غم کی ایک چبھن بھی پیدا نہیں ہوتی۔ عین اُس وقت جبکہ زاہدانِ شب زندہ دار راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر تسبیح ہزار دانہ کو گردش دیتے ہیں، تو لاکھوں بندگان الٰہی مظلومیت کی گرد و خاک پر لوٹتے اور تڑپتے ہیں، اور کلمۂ حق کی بیکسی و بیچارگی سے الغیاث! الغیاث! اعینونی یا عباد اللہ! اعینونی یا عباد اللہ![1] کے نالہ و بکا کی صدائیں اٹھتی ہیں۔ اور جبکہ حلقۂ مدارس و مجامع تعلیم میں کتب فقہ کے ابواب قضا و ولایت کے نکات و دقائق حل ہوتے اور صحائفِ حدیث کے ابوابِ اعتصام بالسنت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرح و تفسیر میں مدعیانِ فضل و کمال اپنا اپنا جوہرِ تبحر دکھاتے اور معارکِ مباحث و مطالب سر کرتے ہیں، اور مجالس و محافل وعظ میں غلغلۂ اعملوا و تذکروا ایہم بلند ہوتا اور سامعین کے سروں کو جنبش میں اور دلوں کو شورش میں لاتا ہے، تو عین اُسی وقت

(۱) پناہ! پناہ! اے بندگان خدا میری مدد کرو! اے بندگان خدا میری مدد کرو!

صحنِ مساجد میں تلاوتِ قرآن و وظائف و اوراد کی صدائیں سرگرم ہوتی ہیں اور

اما الخیام فانھا کخیامھم [1]

کا پورا عالم نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی دوسری طرف:

وارٰی نساء الحی غیر نسائھا [2]

کا یہ حال ہوتا ہے کہ ظلم و طغیان کا طوفان ہر چہار جانب سے محیط، شر و فساد کا ایک رستخیز برپا، ظلمتِ بطلان و فتن ہر طرف چھائی ہوئی، نورِ حق و صداقت مستور و محجو بدع و محدثات کی گرم بازاری، منکرات و سیآت کی مقبولیت و طلب کا دور دو اہلِ حق و صدق مظلوم و مقہور، خدا کی زمین پر اُس کے کلمۂ حق و عدل کا کہنا بمنزلۂ جرم ظلم و عدوان کے لئے اجر و بخشش، اعمال و طاعات کی حقیقت بکلی مضمحل اور پژمردہ اور صلاح و خیر سے تمام اجسام و قوالب خالی! یہ سب کچھ علانیہ سورج کی روشنی میں ہو اور مدرسوں میں شور مچانے والے اندھے نہیں ہو جاتے، اور نہ خانقاہوں میں چھپنے وا بہرے ہوتے ہیں۔ سب کے سر کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور اوپر کے کان کھلے، لیکن فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور [3] دل کی بصیر اس طرح اندھی اور عبرت کے کان اس طرح بہرے ہو جاتے ہیں کہ سب کچھ دیکھتے اور

---

(۱) خیمے تو انہیں کے خیموں جیسے ہیں۔

(۲) لیکن مجھے قبیلہ کی عورتیں ان کی سی عورتیں نہیں معلوم ہوتیں۔

(۳) وہ آنکھیں کو نہیں بلکہ ان دلوں کو اندھا کر دیتی ہے جو سینوں میں ہیں۔

ومدارس کو تنگنائے رخصت وضعف میں پیچھے چھوڑ کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے۔ فضاء علوّ و رفعت اُس کو اپنی طرف کھینچتی اور سماءِ کمال و کرامت اپنی ساری بلندیوں کے ساتھ اسکے استقبال کے لئے دوڑتا ہے، گویا آسمان اُس کے لئے اتر آتا ہے۔ اور زمین اُس کو خود بخود اچھالنے لگتی ہے، اُس کی ہمت رفعت طلب اور اُس کا حوصلہ متصاعد ومتعارج کسی بلندی پر بھی نہیں رکتا، اور اونچی سے اونچی بلندی کو بھی حضیضِ تسفّل وتنزل سمجھتا ہے مقام عزیمتِ دعوت کی جس بلندی تک بڑے بڑے کارفرمایانِ عہد کی نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتی تھیں اور ضعفاءِ زمان و بیچارگانِ رخصت کے وہم وگمان کو بھی اس تک بار نہ تھا، اُسکا شہبازِ ہمت اور سیمرغِ عزم اُسکی چوٹیوں پر بھی جا کر دم نہیں لیتا اور سرگرم بال افشانی وہمواره صفیر زناں بلند پروازی رہتا ہے۔ ولسان حالہ ینشد ھذ البیت؛

بال بکشا و صفیر از شجر طوبےٰ زن

حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسے !

فصل

یہ جو تم ہر عہدِ ظہورِ اصلاح و دعوت میں دیکھتے ہو کہ ایک طرف تو ہزاروں علماء ملت اور ارباب زہد وطاعت موجود ہوتے ہیں، درس و تعلیم علوم، ہنگامۂ مجالس و مواعظ، غلغلۂ اذکار و اشغال صوامع و زوایا، اور زمزمۂ وطنینِ تسبیح و تہلیل مساجد و معابد بظاہر کسی طرح کی کمی نہیں نظر آتی، خانقاہوں میں مجاہدات و ریاضات کے حلقے قائم

جماعت وامت بلکہ نوع وارض کی نجات کا عشق رکھتا ہو، جس کا حوصلۂ کار اور عزم راہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ ہو جائے کہ خود نہیں ڈوبا، کیونکہ یہ تو ضعف و بیچارگی کا سب سے آخری درجہ ہے، فضیلت و کرامت اس میں کیا ہوئی؟ بلکہ ہر وجود کا ڈوبنا اس کے لئے ماتم اور ہر قدم کی ٹھوکر اس کے لئے موت ہو۔ جبکہ دنیا اس کو سب سے بڑی بڑائی سمجھ رہی ہو کہ خود کنارے پر پہنچ جائیں، تو وہ بتلادے کہ خود بچنا نہیں بلکہ ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کے لئے سمندر میں کود پڑنا بڑائی ہے، اور جبکہ لوگ اپنے اپنے دروازوں کو بند کر رہے ہوں تاکہ راہ کے فتنہ و فساد سے محفوظ ہو جائیں، تو وہ اپنا دروازہ کھول دے اور دکھلا دے کہ بند کر کے چھپ رہنے میں فضیلت نہیں ہے بلکہ کھول کر باہر نکلنے میں، اور اگر باہر امن نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دروازہ کھولنے کا اصلی وقت یہی ہے نہ کہ بند کرنے کا۔ مقام عزیمت و رخصت کا یہی وہ فرق ہے جو ایک صاحب دل نے خانقاہ کے گوشۂ عزلت سے نکل کر شیخ شیراز کو بتلایا تھا:

گفت آن گلیم خویش بدر میبرد ز موج
وین سعی می کند کہ بر آرد غریق را

تو اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ سنت الٰہی اپنی عادت جاریہ کے مطابق قیام حق و دفع باطل کے لئے سرگرم انبعاث و ظہور ہوتی ہے، اور توفیق الٰہی اپنے کسی صلح و امثل بندے کے قلب کا عزیمت دعوت کے لئے انشراح کر دیتی ہے اور اس کے قدم طریق کو منہاج نبوت پر ثابت و مستقیم فرما دیتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام اصحاب علم و فضیلت اور ارباب شرع

آبادیاں اصحابِ علم و پیشوائی سے بھری نظر آتی ہیں، تاہم مقام عزیمتِ دعوت و قیام ہدایت کی اُن میں سے کسی کو بھی توفیق نہیں ملتی۔ کوئی دامن رخصت میں پناہ لیتا ہے، کوئی گوشۂ انزوا و انقطاع میں صرف اپنی عافیت و حفاظت ڈھونڈھتا ہے کوئی راہ میں فتنۂ و فساد کا شور سن کر صرف اِسی کو کافی سمجھ لیتا ہے کہ اپنا دروازہ بند کر لے، کسی پر اضعف الایمان کا درجۂ تنزل و تسفل اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ زبان کو یکسر گنگ اور دست قلم کو یکقلم شل پاتا ہے، اور کسی کو نفسِ خادع اور خاطرِ فاسد ضلالتِ حیل و نفاق میں مبتلا کر کے سرگرم دنیا پرستی و دین فروشی کر دیتا ہے۔ غرضکہ سب کے سب یا تا چار مقام رخصت ہوتے ہیں یا واماندہ ضعف و بیچارگی، اور یا مدہوش غفلت و ہوا پرستی، اُن میں سے ایک حصۂ غالب تو علماء سوء اور دعاتِ فتن و منکرات کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے علماً و عملاً۔ اور جو جماعت علماء حق کی باقی رہتی ہے، وہ بھی ضعف کدۂ رخصت سے قدم باہر نہیں نکالتی، اور حق کی بڑی سے بڑی بات اور تقویٰ و طہارتِ نفس کی بڑی سے بڑی فضیلت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اپنے قدم کو لغزش نہ ہو، اور جبکہ ایک دنیا امواجِ ظلمت و فساد میں ڈوب رہی ہے تو ہم کنارۂ سلامتی پر قدم جمائے باقی رہ جائیں۔ گویا ایمان کا جو سب سے ادنیٰ اور نچلا درجہ عامۂ ناس اور ضعفاء عمل کے لئے تھا، وہی خواص امت اور ہداۃ و مرشدینِ ملت کے لئے بلندی و عروج کا سب سے اونچا مقام ہو جاتا ہے، اور سب سے بڑا متقی انسان وہ سمجھا جاتا ہے جس کے قدم "جہاد بالقلب" کی پائیں بساط سے پیچھے نہ ہٹیں، لیکن کوئی نہیں ہوتا جس کا عزم ایمانی توقف و سکون کی جگہ طالبِ اقدام و سبقت ہو، جو اپنے نفس کی نجات کی جگہ

پھر جس طرح ہر قسم و جماعت میں حسب حال و استعداد فرق مراتب و معارج ہوتا ہے، اُسی طرح سابقون بالخیرات کے بھی مختلف مراتب و مقامات ہیں اور کتاب و سنت نے اُن کے حالات و علائم بتلائے ہیں۔ ازانجملہ سب سے اعلیٰ و امثل طبقہ اُن اخص الخواص نفوسِ مزکّی کا ہے جن کو قائدِ توفیقِ الٰہی و سائقِ فیضانِ ربانی عزائم امور کے لئے چن لیتا ہے، کہ وان ذالک لمن عزم الامور اور جن کا نور علم و عمل مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ، اور جن کا قدم طریقِ منہاج نبوت پر واقع ہوتا ہے۔ انہی افراد خاصہ کو حدیث بخاری میں محدّث ابالفتح کے لفظ سے تعبیر فرمایا، اور یہی مورد و مصداق حدیث مجدد کے ہیں جو مختلف طرق سے مروی اور اس لئے بلحاظ صحت ملکی اُس کی صحت میں کلام نہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا وجود فی الحقیقت نظام حق و ہدایت کا مقوّم و منظم ہے، اور انبیاء کرام کی اصلی وراثت انہی میں منتقل ہوتی ہے۔ البتہ یہ مقام ازبس ارفع و اعلیٰ ہے، اور ہر عہد و دور میں صرف چند نفوس قلیلہ ہی ایسے ہوتے ہیں جن کا قدمِ ہمت امتحان گاہِ مصائب و مہالک سے آگے بڑھ کر وہاں تک پہونچتا ہے اور اپنے عہد کے سب سے بڑے عمل حق کو انجام دیتا ہے۔ اِس کے لئے نہ تو مجرد علم و تدریسِ کتب کام آتی ہے نہ صوم و ہیآت زہد و انقطاع، نہ مدارس و معابد دینیہ کے غلغلہ و ہنگامِ تعلیمات کو اس میں دخل ہے اور نہ صومعہ و خانقاہ کے گوشۂ انزوا کو۔ ان کے عہد میں علماء و اصحاب مشیخت کی کمی نہیں ہوتی، اور کچھ یہ بات بھی نہیں کہ مدرسے اجڑ جاتے ہوں خانقاہیں منہدم ہو جاتی ہوں، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کثرت و شہرت کے لحاظ سے اُن کا زمانہ علماء و مشائخ امت کا سب سے بڑا مجمع و ماویٰ ہوتا ہے اور آبادیوں کی

وہ بھی مؤمن ہے۔ لیکن اس آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔ حتیٰ کہ رائی برابر بھی ایمان نہیں ہو سکتا۔ تو اس حدیث میں بھی وہی تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اصحابِ عزیمت کا، دوسرا اصحابِ رخص کا، تیسرا ضعفاء طریق کا، "وذالک اضعف الایمان" اور اس آخری درجہ پر ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے کہ: ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل! یہاں ذکر اگرچہ صرف مبتدعین و محرفین شریعت کے خلاف جہاد ید و لسان کا ہے لیکن اصل تقسیم اس میں محدود نہیں۔ مقصود نفس عزیمت و اسبقیت بالخیرات ہے۔ اور یہ کہ ہر میدان علم و عمل میں ایک درجہ عزیمت کا، ایک رخصت کا، اور ایک ضعف و انحطاط کا ہوتا ہے۔ البتہ اس تقسیم کا سب سے بڑا میدان عمل مقام دعوت و تبلیغ حق ہے کہ اسی وادی فصل اور عقبۂ آزمائش میں اصحاب طریق کے ادبار و اقدام کا فیصلہ ہوتا، اور مدارج ایمانیہ و مراتب علمیہ و عملیہ کے جوہر کھلتے اور امتیاز پاتے ہیں۔ یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات۔(1)

در مدرسہ کس را نہ رسد دعوئ توحید

منزل گہ مردان موحد سر دار ست!

پس پہلا درجہ ہر حال میں "السابقون السابقون"، "منفقون الاولون"، "اسبق بالخیرات" و "مجاھدون بالعل و الجوارح" کا ہے جو جماعت "مقتصد" پر بھی شرف و مزیت رکھتے ہیں، اور ضعفاء طریق تو ان کے جولانِ کمال کی گرد و غبار بھی نہیں پا سکتے،

---

(1) تم میں جو ایمان لائے ہیں اور علم کی دولت پا چکے ہیں، خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔

دعوت کا ہوا۔ اس سے بھی واضح تر حدیث ابن مسعود (رض) ہے کہ "مامن نبی بعثہ اللہ فی امۃ قبلی الا کان لہ فی امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ ثم انہا تخلف من بعد ہم خلوف یقولون ما لا یفعلون و یفعلون ما لا یؤمرون فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل"! (مسلم) یعنی سنت الٰہی یہ ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں اور تربیت یافتہ یاروں کی ایک جماعت امت میں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ جماعت حواری یا اصحاب کے لقب سے ملقب ہوتی ہے اور درسگاہ نبوت کی سب سے پہلی تعلیم یافتہ جماعت ہوتی ہے(1)۔ یہ لوگ نبی کی سنت کو قائم رکھتے اور ٹھیک ٹھیک اوس کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی شریعت الٰہی کو جس حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے، اُس کو بعینہ محفوظ رکھتے اور اوس میں ذرا بھی فرق آنے نہیں دیتے ہیں۔ لیکن ان کے بعد بدع و فتن کا دور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہونے لگتے ہیں جو اسوۂ نبوت سے منحرف ہو جاتے ہیں اُن کا فعل اُن کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے اور اُن کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے شریعت نے حکم نہیں دیا، سو ایسے لوگوں کے خلاف جس کسی نے قیام حق و سنت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا [illegible] زبان سے کام لیا، وہ بھی مومن ہے، جس نے جہاد لسانی [illegible] دل تک [illegible] کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا"

(2)

(3)

[illegible] دیکھنا چاہئے۔

من انفق من قبل الفتح وقاتل، اولئك اعظم درجة من الذين انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ (۱) اصل و بنیاد فرق مراتب و تقسیم مدارج کی ایک ہی ہے۔ مگر اس نے علم و عمل کے مختلف میدانوں میں مختلف حیثیتوں سے مختلف ناموں اور صورتوں میں ظہور کیا ہے۔ اور یہ جو کچھ کہا گیا باب اشارات سے ہے واز قبیل اخذ مطالب کثیرہ بکلمات یسیرہ و قلیلہ، ورنہ تقسیم طبقات و مراتبِ امت و اصحابِ اعمال و دراست کا موضوع منجملہ معارف مہمہ و غامضہ کتاب و سنت کے ہے، اور :

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اسی فرق مراتب اور تفضیل اصحابِ عزائم و عوت والقوی من حق علی اصحاب الرخص و ضعفاء الطریق کی طرف حدیث ابو سعید خدری (رض) عند مسلم میں اشارہ فرمایا، اور اسکو بھی آیات کریمہ متذکرہ صدر کے ساتھ بہ یک نظر دیکھنا چاہیے کہ "من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، وان لم یستطع فبلسانہ، وان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان" تم میں سے جب کبھی کوئی شخص برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے کام لے کر اس کو دور کر دے اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے، اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو دل سے، اور یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے۔ پس اس حدیث میں بھی تین درجے فرمائے، اور جس طرح آخری درجہ اضعف الایمان کا ہوا، اسی طرح پہلا درجہ اقوی و امثل کمال مرتبہ عزیمت

(۱) تم میں برابر نہیں ہیں وہ لوگ جنھوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی، وہ اُن سے کہیں اونچے درجہ کے ہیں جنھوں نے (فتح مکہ) کے بعد خرچ کیا اور لڑائی کی، دونوں سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے۔

کائنات ارضی اور نوع انسانی میں جماعت "من انعم اللہ علیہم" ان چار قسموں سے باہر نہیں من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولئٰک رفیقا اور پھر یہی وہ مرتبۂ اعلیٰ اور درجۂ کبریٰ منجملہ اقسام ثلاثہ "السابقون السابقون" کا ہے جو "اصحاب المیمنۃ" سے بھی بلند تر ہے اور سبقت واقدام اور اولیت وارفعیت صرف اسی کے حصے میں آئی ہے۔ اولئٰک المقربون فی جنات نعیم ثلۃ من الاولین وقلیل من الآخرین[1]

اور بلحاظ اصل واساس تقسیم یہی وہ فرق ہے جس نے ایک دوسرے میدان میں اصحاب عمل کو دو جماعتوں میں منقسم کر دیا، اور دوسری نے پہلی سے ارفع واعلیٰ مرتبہ پایا کہ لایستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاہدون فی سبیل اللہ باموالہم وانفسہم[2] اور اگرچہ دونوں جماعتیں مومنین صادقین کی ہیں۔ کلا وعد اللہ الحسنیٰ[3] لیکن فضل اللہ المجاہدین علی القاعدین اجراً عظیماً[4] کے مفاضلۂ مدارج وتفاوت مناہج کا قانون بھی قطعی وناگزیر ہے اور سب سے آخر یہ کہ اسی عزیمت واولیت اقدام کے بنیادی فرق نے "منفقون قبل الفتح" کو "الذین انفقوا من بعد" پر فضیلت بخشی کہ ساری بڑائی سب سے پہلے قدم اٹھانے والے کے لئے ہے نہ کہ ڈھونڈتے ہوؤں کو دیکھ کر دوڑنے والوں کے لئے، اگرچہ چلنے والے قدم بہرحال بیٹھے ہوؤں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ لایستوی منکم

---

(۱) وہی لوگ عیش کی جنتوں میں مقرب ہیں، ایک جماعت اولین میں سے اور کچھ لوگ آخرین میں سے۔

(۲) بے روگ بیٹھنے والے مومن اور راہ خدا میں اپنی جان ومال سے مجاہد برابر نہیں ہیں۔

(۳) ہر ایک سے خدا نے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

(۴) ... ہوؤں پر اجر عظیم میں فضیلت دی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ جمال الدین اور شیخ داؤد رحمہا اللہ کے تذکرہ میں اُن کی ہمت و شجاعت

حق پرستی و حق گوئی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور حکومت وقت

کے مقابلہ میں اون کی صلابت و بے پروائی بیان کرتے ہوئے ذیل کی حدیث

درج کی ہے پھر فصل کے ماتحت "دعوت و عزیمت" کی بحث شروع ہوتی ہے (ع۔ق)
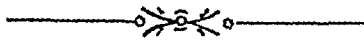
"افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر" (رواہ الترمذی وابو داؤد وابن ماجہ)

فصل ۱

فی الحقیقت یہی وہ مقام منتہا، درجۂ عزیمت و سبقت بالخیرات باذن اللہ ہے جس کو

قرآن حکیم نے "عزم امور" سے تعبیر کیا ہے: "ان ذالک لمن عزم الامور" اور یہی وہ طبقات

ثلاثۂ اعمال انسانیہ کا آخری اور اعلیٰ طبقہ ہے جو صرف وصول الی الحق ہی پر قانع نہیں ہوجاتا

بلکہ جادۂ حق میں سب سے آگے نکل جانا اور بڑھ جانا چاہتا ہے اور جس کا مرتبہ اصحاب "اقتصاد"

سے بھی مافوق و ارفع ہے "فمنھم ظالم لنفسہ، ومنھم مقتصد، ومنھم سابق بالخیرات

باذن اللہ"(۱) اور یہی مقام ہے جو ایک دوسری تقسیم میں مرتبۂ "صالحین" سے مرتفع ہو کر مرتبۂ "شہداء"

یعنی شاہدین حق تک پہونچتا اور پھر "صدیقیۃ" تک پہونچکر انسانیت کبریٰ کے آخری نقطۂ علو

ارتفاع و مرکز دائرۂ نوع، و مبدء کمال و ارتقاء بشری یعنی مقام نبوت سے ملحق ہو جاتا ہے

---

(۱) اُن میں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور اُن میں معتدل ہیں اور اُنہیں (اذن الٰہی سے نیکیوں کے ساتھ سبقت لیجانیوالے

یہ رسالہ دراصل حضرت مولانا کی مشہور کتاب "تذکرہ" کی بعض درمیانی فصلوں سے مرتب کیا گیا ہے جن میں ضمناً دعوت و تجدید امت کی بحث آگئی تھی اور اس سلسلہ میں بعض ایسے معارف کا انکشاف ہوا تھا جو شاید ہی اس سے پہلے کسی قلم و زبان سے آشنا ہوئے ہوں۔ یہی دیکھکر میں نے مناسب سمجھا کہ یہ بحث علیحدہ رسالہ کی صورت میں شائع ہو جائے تاکہ وہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ پبلک میں آجائے۔

رسالہ میں جتنی آیتیں، حدیثیں اور عربی عبارتیں آئی ہیں، اُن کا ترجمہ فٹ نوٹ میں دیدیا ہے تاکہ مطالعہ میں آسانی ہو۔ اصل مبحث کے متعلق جتنے حاشیے ہیں، خود حضرت مولانا کے ہیں۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

رسالہ

عزیمت و دعوت

از خامہ

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

پبلشر

پبلک لائبریری

۴۲ب رپن اسٹریٹ۔ کلکتہ

مطبوعہ ستارۂ ہند پریس ۵ بنیا پوکھر لین کلکتہ